ٹوٹتی جڑتی زندگی
افسانے / کہانیاں
عبدالرشید راہگیر (لداخی)

محترم سلیم سالک کی خدمت میں

بخلوص و آداب -

عبدالستار [illegible]

افسانے/کہانیاں

ٹوٹتی جُڑتی زندگی......

عبدالرشید راہگیر (لداخی)

ISBN: 978-81-19234-99-8

نام کتاب	:	ٹوٹی جڑتی زندگی
مصنف	:	عبدالرشید خان راہگیرؔ (لداخی)
نوعیت	:	افسانے/کہانیاں
کمپوزنگ / سیٹنگ	:	عُزیر اشرف ڈار/ فیروز احمد کمار
سرورق	:	زبیر قریشی،
سنہ اشاعت	:	2024ء
تعداد		500
طباعت	:	میزان سروسز
قیمت	:	روپے: -/350

کتاب ملنے کا پتہ

☆ شاہین بُک سیلر، نزدیک جامع مسّجد، کرگل (لداخ)

☆ عبدو بک ڈپو کرگل ----8899670643

☆ Uneeq بک سیلر کرگل ---9797148366

☆ Best Book Seller بمقابل بیسکو اسکول، لال چوک سرینگر، کشمیر

☆ میزان پبلشر بٹہ مالو سرینگر کشمیر

☆ **مصنف سے رابطہ کے لئے:----- 7006236417**

اِنتساب

اپنے مرحوم والدین کے نام جنہوں
نے با شعور ہونے تک میری قدم
قدم رہنمائی کی۔ اخلاق اور
دیانتداری کا درس دے کر عزت
اور غیرت سے جینا سکھایا۔

رشید راہگیرؔ (لداخی)

قناعت نہ کر عالمِ رَنگ و بُو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

علامہ اقبالؔ

ترتیب

............☆☆☆............

کہی ان کہی

رشید راہگیرؔ (لداخی) کی زندگی کی سب سے بڑی خوبی یہ رہی ہے کہ وہ ایک معلم کی حیثیت میں طلاب کو اردو زبان پڑھاتے رہے اور خود بھی زبان کی ادبی اور علمی صلاحیتوں سے فیضیاب ہوتے رہے۔ اِس پس منظر میں وہ ایک افسانہ نگار کی صورت میں فِکشن کے کینواس پر اُبھرنے لگے۔ اب سے کئی برس قبل سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد افسانہ نگاری اُن کی مصروفیات کا ایک اہم اور مخصوص صورت اپنا چکی ہے۔ اُن کا تعلق لداخ سے ہے اور لداخ کے افسانہ نگاروں میں عبدالغنی شیخ کے بعد جو دوسرا اہم نام سامنے آتا ہے، وہ رشید راہگیرؔ کا ہی نام ہوسکتا ہے۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ لداخ میں اردو افسانہ صرف اِن ہی دو قلم کاروں تک محدود ہے، لیکن جب بھی لداخ کی دھرتی سے تعلق رکھنے والے اردو افسانہ نگاروں کی بات ہوگی تو یہ دونوں افسانہ نگار صف اول میں نظر آئیں گے۔ عبدالغنی شیخ تو اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہے۔ لداخ کی سرزمین سے اردو فِکشن کے تعلق سے جو نئے چہرے سامنے آئے ہیں وہ بھی شیخ صاحب کی ادبی صلاحیتوں سے بخوبی واقف ہیں اور اُن کی رہبرانہ کردار کی تعریف کرتے ہیں۔ اُن کا ادبی تجربہ وسیع ہے۔ اُن کی کئی تصنیفات منظر عام پر آچکی ہیں۔

رشید راہگیرؔ کا پہلا افسانوی مجموعہ ''اندھیرا سویرا'' کے عنوان سے کئی برس قبل منظر عام پر آچکا ہے۔ اُن کے افسانے مختلف جرائید و رسائیل میں بھی بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں، اور پسند بھی کئے جاتے ہیں۔ ''اندھیرا سویرا'' سے قبل اُن کا ایک ناول ''احساس'' بھی شائع ہوچکا ہے۔ اب اُن کا ایک اور افسانوی مجموعہ ''ٹوٹتی جڑتی زندگی'' کے نام سے

منظر عام پر آرہا ہے۔ یہ مجموعہ ۱۳ افسانوں اور کہانیوں پر مشتمل ہے۔

رشید صاحب کے افسانے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اِن افسانوں میں یک رنگی نہیں ہے، بلکہ ہر افسانے میں ایک نیا رنگ نظر آتا ہے۔ کہانی سوچنے کا رنگ، کہانی کہنے کا رنگ، کہانی لکھنے کا رنگ۔ اُنھیں جب لگتا ہے کہ رنگ ایک دوسرے سے خلط ملط ہونے لگے ہیں تو اُن کے اندر کا افسانہ نگار ایک مصوّر کا روپ اپنا لیتا ہے جو اِن رنگوں کو مصورانہ انداز میں پیش کرنے کی راہ ہموار کر لیتا ہے۔ ایک اقتباس......

"باولی نہ بنو نیلوفر...... میں تمہارا قصوروار ہوں۔ اِس میں میری اماں کی کوئی خطا نہیں۔ تمہارا میرا معاشقہ چلتے وقت وہ بیچاری وہاں تھی ہی نہیں۔ اور پھر یہ بچی تو معصوم ہے، اِس کا کیا قصور...... تم خود سوتیلی ماں کی سنگدلی سے ہو کر گذری ہو۔ ذرا سوچو کتنا دُکھ ہوا تھا تجھے۔ کِتنی راتوں کو روئی تھی تُم...... آج تم بھی ممتا انڈیلنے کی بجائے کٹھورتا دکھاؤ گی تو اِس کم سِن کے ننھے سے دِل کو کتنی ٹھیس پہنچے گی۔ تجھے تو اپنی ظالم ماں کی سنگدلی سے کچھ سبق لینا چاہئیے۔ خدا کے لئے نیلو...... اپنی سوچ بدل ڈالو۔"

(موم کی گُڑیا)

دوسری اہم بات اُن کے افسانوں کے تعلق سے یہ کہی جاسکتی ہے کہ اِن میں مقامی رنگ نظر آتے ہیں، مقامی مٹی کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ پیار و محبت کے پسِ منظر میں بھی مقامی کردار ہی نظر آتے ہیں۔ شائد اسی لئے اُن کے پیار بھرے، محبت بھرے لہجے میں برفیلے پہاڑوں کی وسعتیں دِکھائی دیتی ہیں۔ اِن برفیلے پہاڑوں کی اونچائیوں کو دھرتی پر لاکر اپنے افسانوں کا حِصہ بنانا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ سب سمیٹنے کے لئے محنت لگن سنجیدگی اور شائستگی کی ضرورت سے اِنکار نہیں کیا جاسکتا۔ رشید راہگیر لداخی اکثر یہ ہمت لگن اور

سنجیدگی اپنے اندر جھانک کر حاصل کرتے ہیں۔ کبھی وہ طالب علم بن جاتے ہیں اور کبھی اُستاد، کبھی جوانی کے فِکر و انداز اپنا لیتے ہیں اور کبھی بزرگی کا لباس اوڑھ لیتے ہیں۔ کبھی قلم کار اور کبھی قاری بن کر اپنی تخلیقات کا جائیزہ لیتے ہیں۔ میں تو یہ اُن کی خوبی سمجھتا ہوں مثلاً

''میں اُس سے کافی گھُل مِل چُکا ہوں۔ اُس کے عادات و اطوار سے واقف ہو چُکا ہوں۔ اُس کی طرح میں بھی جواں ہوں۔ مجھ پر بھی شباب کے گُل بوٹے کھِلے ہیں، مگر مجھے رومانس میں کوئی دلچسپی نہیں...... اُس کے رومانی قِصوں میں بھی نہیں ...... وہ پھر بھی چٹخارے لے لے کر اپنے فحشی کرتوت سناتا رہتا ہے۔ ایک چھٹے ہوئے شہوت پرست، بدچلن کی نازیبا باتیں...... واہیات قصّے...... جوان جذبات کو اشتعال دلانے کے لئے کِسی بارود سے کم نہیں ہوتے مگر میں بالکل شانت ہوں۔ مجھے اس کی باتوں سے گھِن آتی ہے۔ شائد اس لئے کہ مُہذب پریوار سے ہوں...... اور وہ...... جانے کِس ماحول میں پلا بڑھا ہوگا......''

(سرپھرا)

راگیرؔ صاحب کی ایک اور بھی خوبی ہے، وہ یہ کہ اُن کے لہجے میں شرافت، گفتار میں نرمی...... اپنے سے بڑے ہوں یا چھوٹے، بات شرافت سے ہی کرتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھار تیر و نشتر بھی چلا لیتے ہیں اور جب ضرورت پڑے تو ظریفانہ انداز بھی اپناتے ہیں۔ اِس میں اُن کا قلم بھی ہمیشہ ساتھ دیتا ہے۔ جیسا کہ یہ اقتباس......

''وہ چلے گئے''

اتنا سُننا تھا کہ ہیٹر کی تپش کے مارے جھلستا شوہر چیختا چِلاّتا ہوا لحاف کے اندر سے سپرنگ کی طرح اُچھل کر نِکل آیا اور لگا بے تحاشہ فرشِ خاکی پر پچھاڑیں کھانے۔

''ارے بچالو۔ ارے ہائے ہائے جلا ڈالا ظالموں نے ...... ہائے
ہائے۔ ارے کوئی تو پانی ڈالو۔ ہائے میری ٹانگیں...... ارا۔ ارا۔ ہائے
میں جلا۔''

(اِستحصال)

عبدالغنی شیخ صاحب کا ذِکر میں کر چُکا ہوں۔ شیخ صاحب نے راہگیرؔ صاحب کے تعلق سے اپنے تاثرات یوں ضبط تحریر میں لائے تھے۔

''کوئی کوئی پیدائشی داستان گو ہوتا ہے۔ عبدالرشید راہگیرؔ میں
داستان گوئی کی صلاحیت ہے۔ وہ لفظوں کی جادوگری اور کہانی
کے تانے بانے سے قارئین میں یاس وبیم اور خوشی و اُداسی پیدا کر
سکتے ہیں۔''

(ناول ''احساس'' ۲۰۱۱ء)

عبدالرشید راہگیرؔ صاحب پیشے سے ایک اُستاد رہے ہیں اور بحیثیت اُستاد بھی اُن کا کردار بہت ہی اونچائیوں کو چھوتا رہا ہے۔ احسن اعلیٰ تعلیمی خدمات کے پسِ منظر میں ۲۰۰۷ء میں ریاستی سطح پر بہترین اُستاد کے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔

راہگیرؔ صاحب کا ناول ''احساس'' مجھے بھی پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ تب بھی میں نے ناول کے پیش لفظ میں راہگیرؔ صاحب کے تعلق سے لکھا تھا۔ ''رشید راہگیرؔ صاحب اپنی کہانیوں میں زندگی کی تلخ سچائیوں کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔'

میں نے محسوس کیا ہے کہ راہگیرؔ صاحب اپنے افسانے لکھتے وقت لداخ کے سماجی معاشرتی اور تہذیبی پسِ منظر اور ماحول کو اپنی سوچوں میں چھپائے رکھتے ہیں اور پھر یہ سوچیں قلم کا سہارا لیتی ہیں ...... اپنی کہانیاں اپنے افسانے سمیٹنے میں لداخی ماحول اور لداخی رہن سہن نے راہگیرؔ صاحب کی بڑی مدد کی ہے۔ لداخ میں بھائی چارہ اور دوستی کا جو ماحول ملتا

ہے وہ راہگیرؔ صاحب کی کہانیوں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے یا محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ایسا ماحول لداخی صاحب کی اُن کہانیوں میں بھی نظر آتا ہے جن کا لداخ کی سرزمین سے کوئی تعلق نہیں۔

اِس افسانوی مجموعے میں جتنے بھی افسانے شامل کئے ہیں ان میں کوئی نہ کوئی اِصلاحی پہلو ضرور نظر آتا ہے، ان اِصلاحی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اِس لئے کہ اِن اصلاحی پہلوؤں کے پسِ منظر میں نہ صرف ایک افسانہ نگار نظر آتا ہے بلکہ ایک اُستاد کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ افسانہ، افسانہ نگار کے بطن سے پھوٹتا ہے۔ عبدالرشید راہگیرؔ (لداخی) کے افسانوں کو اِسی پسِ منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

۱۵/ جون ۲۰۲۳ء نورشاہ

سرینگر

حرفِ چند

عبدالرشید راہگیرؔ (لداخی) کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''ٹوٹتی جڑتی زندگی'' منظرِعام پر آیا ہے۔ مجموعے میں ۱۳ کہانیاں ہیں ساری کہانیاں راقم الحروف نے پڑھی ہیں۔ عبدالرشید راہگیرؔ نے اِن افسانوں میں اپنے ماحول، معاشرہ اور اِردگرد کی زندگی میں پیدا شُدہ مسائل اور واقعات کو اُجاگر کیا ہے۔ اِس سے پہلے مُصنّف کا پہلا افسانوی مجموعہ ''اندھیرا سویرا'' شائع ہوا ہے۔ اور ان کا ناول ''احساس'' Public Domain عوامی دربار یا قلمرو میں آکر داد و تحسین حاصل کر چُکا ہے۔ راقم الحروف نے دونوں کتابیں ذوق سے پڑھیں۔

رشید راہگیرؔ (لداخی) نے ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی ایک شناخت بنائی ہے اور اپنے فن میں پختگی حاصل کی ہے جو اِن کی زیرِنظر کتاب میں نظر آتی ہے۔

ہم دونوں نے افسانے لکھے ہیں۔ ہمارے افسانوں کے موضوعات عمومی طور کشمیر اور لداخ کے گرد گھومتے ہیں۔ اِس طرح ہم نے کشمیر کے اردو قارئین کو لداخ سے اور لداخ کے اردو قارئین کو وادی کشمیر اور بیرون کشمیر سے، اور لداخ کو کہانیوں کے توسط سے اِن دونوں خطوں کی گوناگونی اور رنگارنگی سے روشناس کیا ہے۔

راہگیرؔ (لداخی) افسانوی تکنیک سے کماحقہٗ واقف ہیں۔ اور حقیقت نگاری کے قائل ہیں۔ وہ تجریدی، تمثیلی، علامتی اور استعارتی افسانے نہیں لکھتے۔ اِس لئے ان کا پلاٹ پیچیدہ نہیں ہوتا۔ یہ ماحول کی پیداوار اور زندگی کے دین ہیں۔ اسی لئے کردار جیتے جاگتے، مکالمے برمحل اور موافق منظر نگاری کہانی سے بھرپور میل کھاتی ہے، جیسے کہ زیرِنظر مجموعہ کی کہانی ''ٹوٹتی جڑتی زندگی'' کا اِن مبادیات پر پورا اُتر کر دل نشین تاثر چھوڑنا۔ کہانی میں روانی

ہے۔ بیک وقت نفرت، محبت ، ہمدردی، بدگمانی، ذہنی کشمکش کے علاوہ اضطراری و بے اختیاری کیفیت کا بیان ہے۔

''موم کی گڑیا'' اسی قبیل کی ممتا، بددلی اور جذبہ ایثار کے اعتبار سے ایک دلچسپ کہانی ہے۔ معصوم بچی کے گرد گھومنے والی اِس کہانی میں نئی ماں نیلوفر پر، معصومیت میں جو بھید کھُلتا ہے وہ بے حد چونکا دینے والا ہوتا ہے۔ جس سے خوش مزاج نیلوفر کے رگ و پے میں تلخی بھر جاتی ہے اور کہانی کو ایک نئے موڑ سے گذرنا پڑتا ہے۔

رشید راہگیرؔ کی کہانیاں بیانیہ اور مکالماتی دونوں انداز میں سفر طے کرتی ہیں۔ جو مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی یکسانیت نہیں ہوتی۔ جیسے کہ ادبی، رومانی، اساطیری، اور سسپنس بھری کہانیاں۔

''روشن ضمیر'' دو مسلکی پریمی جوڑے کی اعتقاد و اعتماد پر مُبنی کشمکش بھری کہانی ہے۔ اِس کہانی میں رشید راہگیرؔ نے مسلکی تفاوت سے پیدا ہونے والے اِنتشار، افہام و تفہیم کی معدومی کا احساس اور بے قابو جذبات کا نقشہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔ کہانی شش و پنج کے مرحلوں سے گذر کر پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ فکر انگیز کہانی ہے۔ صاحب بصیرت اور روشن خیال لوگوں کو ضرور متاثر کرے گی۔

عبدالرشید راہگیرؔ کی کہانیوں میں تنوع ہے۔ وہ پُر اسرار اور سنسنی خیز کہانی لکھنے کے گُر سے آگاہ ہیں اور شروع سے آخر تک قاری کا تجسُس برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں۔ ''عشق ناتراشیدہ'' اِس ضمن کی ایک کہانی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار دیہاتی خاتون آبادیوں سے دُور ایک الگ تھلگ مقام پر یک وتنہا پُر ہول مکان میں حیران کُن تجربات سے گذرتی ہے۔ اس خوفناک کہانی کا ردعمل، شک یا یقین میں قاری پر چھوڑتا ہوں۔

انسان جیسا بوتا ہے ویسا ہی کاٹتا ہے۔ یعنی انت بُرے کا بُرا اور بھلے کا بھلا ہی ہوتا ہے، پھر چاہے صاحب حیثیت ہو یا بارسُوخ۔ آخرت میں روسیا تو ہوتا ہی ہے۔ دنیا کے

عذاب سے بھی نہیں بچ پاتا۔ وادی کشمیر کے سیلابی پس منظر میں لکھی ہوئی کہانی ''آبی ہیولا'' اور لداخ کے پس منظر کی تحریر ''سر پھرا'' اسی قبیل کی دو سسپنس بھری کہانیاں ہیں۔ دونوں کے پلاٹ اسقدر اثر انگیز ہیں کہ قاری اختتام تک تجسّس میں مبتلا رہتا ہے کہ اب کیا ہوگا......اب کیا ہوگا؟

ایک افسانہ نگار کی خوبی اور کامیابی کی کسوٹی یہ ہے کہ قاری افسانے کو ایک ہی نشست میں ختم کرتا ہے۔ مذکورہ دونوں کہانیوں میں قاری انجام جاننے کے لئے آخر تک مضطرب اور بے تاب ہوتا ہے۔

کشمیر میں حالیہ شورش کی تاریخ بڑی المناک اور پیچیدہ ہے۔ اِس شورش نے اَن گنت لوگوں کی زندگی میں رنج و ملال گھول دیا ہے۔ متاثرین بے روزگاری، بھوک مری اور گونا گوں مصائب سے دوچار ہوئے ہیں۔ ''جینے کی آس'' اِس موضوع پر تذبذب بھری کہانی ہے۔ اِس میں بھوک، تنگدستی، احتجاج، فسادات و مظلومیت کی حسب موقع تصویر کشی کی گئی ہے۔ کہانی عصری حمیت کی آئینہ دار ہے۔ واقعی کہانی کار ایک حساس دِل رکھتا ہے۔

اچھے ادب کی تخلیق کے لئے گہرے مُشاہدے اور مطالعے کی ضرورت ہے۔ تخلیق کار اِن خوبیوں سے مالا مال ہے۔ وہ کہانی کے اختتام تک قاری کی دلچسپی اور ذوق کو قائیم رکھنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔

راہگیرؔ (لداخی) کو زبان پر دسترس ہے، وہ کفایت سے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور بے جا عبارت آرائی سے گریز کرتے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ میں کئی کہانیاں مذکورہ حقایق کی غماز ہیں۔

کہنا آسان ہے اور عمل کرنا مشکل۔ افسانہ ''میاں فصیح'' قول و فعل کے تضاد کو اُجاگر کرتا ہے۔ بدنیتی کا منطقی انجام بُرا ہوتا ہے۔ افسانہ ''بدنیت'' اِسی صداقت کی عکاسی کرتا ہے۔ افسانہ ''استحصال'' پڑھ کر قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ غریب صارفین سے

ہمدردی کی جائے یا سرکاری محکمہ کی چھاپہ مار ٹیم کے ارکان کی حمایت کی جائے۔ افسانہ حقیقت نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔

''ٹوٹا ستارہ''...... پیار محبت کی اِس کہانی میں لڑکے کی بے وفائی پر لڑکی کا دل ملول رہنا اور جلد بازی میں غلط فیصلہ کر کے جان جوکھم میں ڈالنا کہانی کو دلچسپ اور پر تجسُس بناتا ہے کہ قاری ایک ہی نشسّت میں پوری کہانی پڑھے بنا نہیں رہ پاتا۔ یہی بات قلمکار کے کامیابی کی ضمانت ہے۔

ایک ریسرچ سکالر طالبہ بتول نے اگست ۲۰۱۷ء میں حیدر آباد یونیورسٹی سے عبدالرشید راہگیرؔ (لداخی) کی فکشن نگاری پر ایم فِل M.Phil کی ڈگری حاصل کی ہے۔

یہاں یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ عبدالرشید راہگیرؔ ایک آدرش اُستاد بھی رہے ہیں اور محکمہ تعلیم میں اعلیٰ کارکردگی کے عوض بہترین اُستاد ہونے کے ناتے سال ۲۰۰۷ء میں اسٹیٹ ایوارڈ سے نوازے گئے ہیں۔

اُمید ہے۔ اِن کا یہ نیا افسانوی مجموعہ ''ٹوٹتی جڑتی زندگی'' فکشن کے شائقین اور اردو ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔

عبدالغنی شیخ

لیہہ۔ لداخ

رشید راہگیرؔ (لداخی) کے اَفسانے............

حقیقتوں کے آئینہ میں

گذشتہ چند برسوں کے دوران مجھے عبدالرشید راہگیرؔ کے کچھ افسانے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں وہ افسانے بھی شامل ہیں جو ''نگینہ انٹرنیشنل'' میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ افسانے پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ راہگیرؔ صاحب زمانے کی حقیقتوں کو افسانوی صورت میں پیش کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں اکثر، زندگی کی بہت ساری خوبصورتیاں اور بدصورتیاں تصویروں کی صورت اپنا لیتی ہیں۔ اِن تصویروں میں کرب ہے اور درد بھی۔ لداخ کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے افسانوں میں لداخی زندگی، لداخی رہن سہن، لداخی تہذیب وتمدن کی جھلکیاں بخوبی دیکھی جاسکتی ہیں۔ جو اِن افسانوں کو اور بھی دلچسپ بناتی ہیں۔ راہگیرؔ صاحب اپنے افسانوں میں زبان و بیان کی جانب بھرپور توجہ دیتے ہیں اور اپنے افسانوں کو اپنے مخصوص ماحول کا حِصّہ بنا کر ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں اور کبھی کبھار راہگیرؔ صاحب اپنے افسانوں میں ایک اُستاد کی صورت میں بھی سامنے آتے ہیں اور اپنے کرداروں کو راہ راست پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔

جون ۲۰۲۳ء

نیک خواہشات کے ساتھ۔

وحشی سعید

سرینگر

تقریظ

وادیٔ گلپوش کے اردو ادبی دنیا میں عبدالرشید راہگیرؔ ایک جانے مانے فکشن نگار ہیں۔ پچھلے چار دہائیوں سے اُن کے افسانے، کہانیاں وادی کے مختلف جرائد اور بیرون ریاست کے مقتدر رسالوں میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہے ہیں۔ زیرِ نظر افسانوی مجموعہ ''ٹوٹتی جڑتی زندگی'' اُن کی تیسری کامیاب کوشش ہے۔ یہ اُن کی محنت شاقہ کا شجرہ وثمرہ ہے۔

اِس مجموعے سے قبل اُن کی دو نگارشات بالترتیب سال ۲۰۱۱ءاور سال ۲۰۱۴ء میں کتابوں کی صورت میں چھپ کر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ جن میں اولاً لداخ کے پس منظر میں مرقوم ادبی ناول ''احساس'' ہے اور دوئم ''اندھیرا سویرا'' کے عنوان سے ایک افسانوی مجموعہ، جو اُن کے اردو سے شغف ولگاؤ کا بین ثبوت ہے۔

موصوف خطہ لداخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے اردو اُن کی مادری زبان نہیں۔ اس کے باوجود اردو سے سچی عاشقی کا اندازہ اُن کی تخلیقات سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔

رشید راہگیرؔ لداخی عارضہ قلب کی وجہ سے سال ۱۹۷۹ء میں میڈیکل گراونڈ پر علاج معالجے کے لئے وادی کشمیر ٹرانسفر ہوئے اور اور تب سے یہیں اطراف میں خدمات انجام دیتے ہوئے سال ۲۰۱۱ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ موصوف ایک فرض شناس اُستاد رہ چکے ہیں۔ محکمہ تعلیم نے اُن کے کارہائے نمایاں کو سراہتے ہوئے سال ۲۰۰۷ء میں Best Teacher State Award کے لئے منتخب کیا اور وہ یوم اُساتذہ کے پُروقار اجتماع کے موقع پر شہر سرینگر کے مونسپل گراونڈ سنوار میں، سابقہ وزیر اعلیٰ اور سابقہ وزیر تعلیم کے ہاتھوں فسٹ پرائیز، ایک لاکھ روپے کے چیک اور سند افتخار سے سرفراز ہوئے۔

موصوف کے تازہ افسانوی مجموعہ ''ٹوٹتی جڑتی زندگی'' میں ۱۳ افسانے اور کہانیاں شامل ہیں جو وادیٔ کشمیر اور خطہ لداخ کے پس منظر میں رقم کئے گئے ہیں۔ اِن میں نفسیاتی، اخلاقی اور سماجی حالات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اِن کے تخلیقات دلچسپ اور معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ علمی اعتبار سے معاشرے کو مثبت پیغام بھی دیتے ہیں اور زمانے کے ناروا سلوک، عروج و زوال، مکروفریب، چھل کپٹ وغیرہ جیسے موضوعات قارئین کو غور وفکر کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

اگر چہ چند افسانے طویل ہیں مگر خوبی یہ ہے کہ اِن کو پڑھتے ہوئے قاری کو کسی ابہام اور ژولیدگی کا احساس در پیش نہیں آتا، اس لئے کہ اِن میں فن افسانہ نگاری کے تقریباً تمام تر اوصاف بدرجہ اتم موجود ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ شاعر یا فکشن نگار عام اِنسانوں کی نسبت زیادہ حساس اور ذکی الحس ہوتا ہے، اور اپنے گردونواح میں وقوع پذیر حادثات، واقعات اور سانحات سے نہ صرف آگہی رکھتا ہے بلکہ اپنی ذہنی صلاحیت اور کاریگری کے استنباطی عمل سے خوبصورتی کے ساتھ اِن واقعات کو کہانی افسانے کی صورت میں صفحہ قرطاس پر پھیلا کر قاری کو تصورات کی رنگ برنگی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ یہ وصف رشید راہگیر لداخی میں بھی موجود ہے کہ روزمرہ زندگی میں جو کچھ دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، اسی کو موضوع بنا کر محنت شاقہ اور عرق ریزی سے عام فہم، سادہ، شائستہ اور شگفتہ زبان میں مناسب اسلوب و تکنیک کو اپناتے ہوئے افسانوی رنگ میں رنگ دیتے ہیں کہ چشم دید گواہ کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اِن کی خامہ فرسائی کو دیکھ کر اکثر مبصرین اِن کی کامیابی کو بے جا صلاحیت، قابلیت اور مہارت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

لداخ کے پس منظر میں اُن کا ایک رومانی ناول ''مہربان'' جو مُدتوں پہلے پایہ تکمیل کو پہنچ کر اشاعت کا منتظر تھا، سال ۲۰۱۴ء کے تباہ کن سیلاب کی زد میں ڈھل کر ناقابل

مطالعہ ہوگیا، جسے اب موصوف نے بڑی ہی محنت اور لگن کے ساتھ دُرست کر کے قابل اشاعت بنادیا ہے۔ اُمید ہے عنقریب کتابی صورت میں چھپ کر قارئین کی نذر ہوجائے گا۔

زیرِ نظر مجموعہ ''ٹوٹتی جڑتی زندگی'' طباعت، صوری اور معنوی اعتبار سے اعلیٰ اور قیمت کے حساب سے مناسب ہے۔ یہ قیمت اِس دورِ گرانی میں قاری کے لئے کوئی بڑا بوجھ نہیں۔ اُمید ہے ادبی حلقوں میں اِس مجموعے کی بھی پذیرائی ہوگی۔

شیخ بشیر احمد

نواب بازار سرینگر

رشید راہگیرؔ (لداخی) میری نظر میں

عبدالرشید خان راہگیر (لداخی) نے سال ۲۰۱۱ء میں ''احساس'' کے نام سے اپنے اولین ناول کو منظرِ عام پر لاکر ریاست کے ناول نگاروں کی صف میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ یہ ناول لداخ کے پس منظر میں ایک خوبصورت اور دلچسپ ادبی تحریر ہے۔ اس کے بعد سال ۲۰۱۴ء میں موصوف ''اندھیرا سویرا'' کے عنوان سے تیرہ افسانے کہانیوں پر مشتمل ایک افسانوی مجموعہ تخلیق کرنے میں کامیاب ہوئے جو کافی سراہا گیا۔ رشید راہگیرؔ (لداخی) کا اسلوب اور انداز پیش کش اسقدر جاندار اور مقناطیسی ہے کہ آخر تک پڑھے بناء قاری نہیں چھوٹ پاتا۔ اِن کے افسانوں اور کہانیوں میں انسانی سماج میں رونما ہوئے واقعات کا نفسیاتی اثر، احساسات، راست گوئی اور حقیقت نگاری صاف عیاں ہے۔ وہ ادبی نظریات کے ساتھ ساتھ سماجی قدریں اور عزت واحترام کے فن کو اپنے ساتھ چلانے کا ہُنر جانتے ہیں۔ افسانہ ''انجانا خوف'' کو رشید راہگیرؔ لداخی نے گذشتہ تاریخی واقعات کی منظر کشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اِن کے افسانوں میں تاثر عام تر کہانی کے عمل کی پیداوار ہے۔ اِن کے سارے افسانوں کہانیوں کے کردار اِنفرادی نہیں اجتماعی ہیں۔ انسانی مجبوریوں اور دُکھوں کو ظاہر کرنے کے لئے رشید راہگیرؔ نے چلتے چلتے بہ حُسن خوبی حقیقت بیانی سے کام لیا ہے اور ادبی سلیقے سے سماجی ترجمانی، انسان دوستی، حوصلہ اور احساساتِ ذاتی کا نفسیاتی اثر قبول کر کے تمام افسانوں اور کہانیوں کو ضبط تحریر میں لایا ہے اور اپنے گرد رونما ہوئے غیر حقیقی واقعات کو صرف انسانی فائدے کے لئے عیاں کیا ہے۔ وہ ایک عام قاری سے سادہ زبان

میں جذبات اور واقع نگاری کے افسانوں کی صورت میں مخاطب ہے۔ سماج کی مجبور اور مُفلس زندگی کے دُکھوں کو واضح کرنے کے لئے راہگیر نے پُر اثر خیالات کو ادب عالیہ کی صورت میں کہانیوں کا روپ دے کر اپنے معاشرے کو گہرے سوچ کی طرف مائل کرنے کے لئے اپنے قلم، قوتِ حافظہ اور قوت مُدرکہ کا خوب استعمال کیا ہے، جس میں کامیاب رہا ہے۔ واقعی اِن کے افسانوں کو سنجیدگی کے ساتھ پڑھنے والے قارئین، کسی نہ کسی حد تک متاثر ہوئے بنا نہ رہ پائیں گے۔

حال ہی میں موصوف کا دوسرا افسانوی مجموعہ مکمل ہو چکا ہے جو عنقریب ''ٹوٹتی جُڑتی زندگی'' کے عنوان سے دستیاب ہوگا یا پھر ممکن ہے، اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہو۔ اسلئے کہ اِن کی تخلیقات پر خامہ فرسائی کرتے وقت دوسرا افسانوی مجموعہ ابھی تکمیلی مراحل سے گذر رہا تھا، لہٰذہ نظر نواز نہ ہوا۔ بہر حال یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ایسے اہل قلم سے سماج کو آئیندہ بھی وسیع تر توقعات ہیں۔

منظور دائیک

کشمیر ریسرچ انسٹچیوٹ برین کالونی سرینگر

عرضِ حال

کہتے ہیں ہر کامیاب مرد کی کامیابی کے پیچھے عورت کی کوشش کارفرما ہوتی ہے۔ ضرور ہوتی ہوگی، اسلئے کہ والدین کے بعد جوش دلانے اور ہمت وحوصلہ بڑھانے کا قریبی اور پائیدار ذریعہ اپنی شریک رنج وراحت کے سِوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اور پھر پڑھی لکھی حرف شناس ہو تو کیا کہنے، منزلیں خود بہ خود قدموں سے لپٹنے بھاگی چلی آتی ہیں۔ ایسے میں کامیابی سے ہمکنار نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن اگر جوڑی دار ناخواندہ اور علم وفراست سے بے بہرہ ہو تو خدا ہی حافظ۔ مرد بے چارے کی حالت کھڑی چڑھائی پر مشکل سے کھنچتے چڑھتے ٹرک کی سی ہو کے رہ جاتی ہے کہ منزل مقصود کا پانا محال ہو جاتا ہے۔

میں بھی لکھنے پڑھنے کے معاملے میں کچھ ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہوں۔ میری شریک سفر دُور اُفتاد پسماندہ گاؤں کی دیہاتی عورت ہے...... علمِ زراعت میں نمبر ون، ایک گردے کے باوجود کام کاج میں چاق وچوبند، علم وہبی سے مزیّن، پر ہے تعلیم میں زیرو بالکل ناخواندہ...... اُس کے نزدیک میری تحریروں اور مطالعے کی کوئی اہمیت نہیں۔ مجھے صفحہ قرطاس کی ٹیڑھی میڑھی لکیروں میں مستغرق دیکھ کر اکثر فقرے کستی ہے کہ ”رہنے بھی دو۔ کیا رکھا ہے کاغذی لکھا پڑھی میں۔ بیکار میں وقت برباد کرتے ہو۔ کوئی ڈھنگ کا کام کیوں نہیں کرتے، بھلا کاغذ کی ناؤ میں کون پار اُترا ہے۔ کوئی مناسب کام کرو تو چار پیسے گھر آئیں۔“ اور میں زبردست ڈسٹرب ہو کر اُلجھن کے مارے سر کھجا لیتا ہوں۔ بکھیڑے کے ڈر سے کوئی جواب نہیں دیتا۔ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں، پر بین بجانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اُسے کیا معلوم اِن منحنی لکیروں میں خوابوں خیالوں کی کیسی کیسی دنیا آباد ہوتی رہتی ہے۔ اُس کی جیسی

کتنی کٹھ پتلیوں کو ان میں نچاتا ہوں۔ اُٹھاتا پٹختا ہوں۔ ہنساتا رُلاتا ہوں...... مگر اِن باتوں سے اُسے کوئی مطلب نہیں۔ اَصل میں وہ، میری صحت کے لئے فکر مند رہتی ہے۔ تخلیقی کام میں میری یکسوئی اسلئے بھی اُس سے دیکھی نہیں جاتی کہ نہ صرف ظہرانے کی تھالی سامنے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو کر رکھی رہ جاتی ہے بلکہ عصرانے کے وقت گرم چائے کی پیالی بھی عدم توجہی سے یخ بستہ ہو کر اُسے میری صحت کے حوالے سے بے چین کر دیتی ہے۔ ویسے بھی جوانی کے لمبے عرصے تک عارضہ قلب میں مبتلا رہ چُکا ہوں۔ ایسے میں میری صحت کو لیکر اُس کا متفکر رہنا جائیز ہے۔ مطلب یہ کہ میرے تئیں اُس کے مُخلص ہونے میں ذرا برابر شک نہیں۔ لکھنے میں مصروف دیکھ کر چُپکے سے پھل فروٹ کے قتلوں سے بھری طشتری سامنے لا کے رکھ دینا، وقتاً فوقتاً مشروبات مہیا رکھنا۔ اُس کی خوبیاں ہیں۔ کبھی رات کے کسی پہر لکھنے کا مُوڈ بن جائے اور لکھتے لکھتے چائے کی طلب پڑ جائے تو اُسے جگا کر کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بس آنکھ کھُلنے کی دیر ہے...... لکھنے میں مشغول پاتے ہی خامشی سے کڑک قِسم کی لپٹن چائے بنا لانے میں دیر نہیں کرتی۔ رُت جگا دیکھ کر چوں چرا بھی نہیں کرتی۔ البتہ کبھی کبھار دِن دہاڑے یا شام گئے مجھے کھانا پینا چھوڑ کر متواتر لکھتے دیکھتی ہے تو سیخ پا ہو کر میرے تخلیقی عمل میں چائے کی پیالی چینی کی رکابی پر کھنکھنا کر، یا عشائیہ کی طشتری میز پر ہلکے سے کھٹکھٹا کر مخل ہونے سے نہیں کتراتی اور اپنی جانب متوجہ کر کے میرے تخیلات کا سلسلہ یکسر درہم برہم کرنے میں دیر نہیں لگاتی۔ اور میں فقط جل بھُن کر رہنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر پاتا، ماسوائے اِس کے کہ تلملاتے ہوئے ادھوری تحریروں کو مروڑ کر ڈسٹ بن کی نذر کروں۔ یوں میری کہانیوں کے اکثر اچھے خاصے پلاٹ پایۂ تکمیل کو پہنچنے سے پہلے دم توڑ چکے ہیں۔ مکمل ہوئے بھی، تو صحیح پکڑ میں نہ رہ پائے، یا پھر نسیان کے مارے ذہن سے اُتر کر التوا کی کال کوٹھری میں چلے گئے۔

ایک قلم کار کو لکھنے کے لئے جس قِسم کے پُر سکون ماحول کی ضرورت ہونی چاہیے، وہ میرے ہاں دستیاب نہیں۔ ادھر شریک سفر کی ناخوشی، اُدھر عقب میں محض بیس بائیس فٹ کے درمیانی فاصلے پر زیڈ شیپ کی تین منزلہ سرکاری بلڈنگ کے مختلف محکموں کے دفاتر میں

دِن بھر صارفین اور کرمچاریوں کے مابین گلا پھاڑ جُملہ بازیوں کا اُودھم......اور پھر شام کو قریب کی سڑک پر دوڑتے بھاگتے موٹر گاڑیوں کا شور وغل۔ ظاہر ہے یہ سارے حالات میرے لئے بلائے بے درماں بنے رہتے ہونگے۔ میں نے پھر بھی ہمت کی ہے۔ کبھی منکوحہ کی آنکھیں مُندتے ہی اپنی آنکھوں کی نیند چُرا کر لکھنے بیٹھا ہوں۔ کبھی دن دہاڑے خلوت جائے پناہ کی تلاش میں بیابان کی طرف نِکل گیا ہوں......میری حلقہ برادری کے لوگ اکثر مجھ سے میری نئی کتاب میں دیری کی وجہ پوچھتے رہے۔ میں اُن کو سرِ راہ کھڑے کھڑے جواب نہ دے پایا۔ شائید اب تاخیر کی وجہ سمجھ پائیں گے۔

خیر......دیر سے ہی سہی، ساری رکاوٹوں اور گوناگوں مصروفیات کے باوجود چند افسانے کہانیاں قلم بند کرنے میں کامیاب ہوا ہوں جواب ''ٹوٹتی جُڑتی زندگی'' کے عنوان سے افسانوی مجموعہ کی صورت میں آپ کے پیش نظر ہے۔ اِس مجموعے سے پہلے ایک ناول ''احساس'' اور ایک افسانوی مجموعہ ''اندھیرا سویرا'' قارئین کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں۔

ہندوستان کی سرزمین میں انیسویں صدی کے اختتام پر اور بیسویں صدی کے آغاز کی کئی دہائیوں کے بعد اردو کو ہی ہندوستان کی مایہ ناز زبان کا درجہ حاصل ہوا۔ اِس زبان کے رائج ہوتے ہی اردو زبان میں تصنیف و تالیف کو فروغ دینے کے لئے ادارے کھلے۔ خوب ترقی ہوئی۔ قلمکاروں کے حوصلے بڑھے۔ مختلف انواع کے نادر اور مفید کتابیں معرض وجود میں آئیں۔ مگر آج بیچاری یہی اردو بُری طرح کسل مندی کا شکار ہے......اِس کی آبیاری کے بجائے مسلسل بیخ کُنی ہوئی جارہی ہے جو ارباب دانش و قلم کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ اِس جانب فوری توجہ نہ دی گئی تو اردو زبان اور رسم الخط کے سکڑ سمٹ کر نقطے میں بدلتے دیر نہ لگے گی۔

رشید راہگیر (لداخی)

افسانے/کہانیاں

ٹوٹا ستارہ

دن بھر کی سرگرمیوں سے تھکا ماندہ شہرا ونگھ رہا ہے۔

سڑکیں سنسان ہیں۔ چرندو پرند سہمے ہوئے...... کُتے بلیاں خاموش......سبھی اپنے اپنے بلوں، آشیانوں میں دُبکے پڑے ہیں۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں۔

ہر طرف ہُو کا عالم ہے۔

اس ہو کے عالم میں جاگا ہے تو بس، اوپر آسمان میں تاروں کے درمیاں نمایاں چاند، جو دُنیا کے جھمیلوں کی پرواہ کئے بغیر اپنی منزل کی اور رواں دواں ہے...... یا پھر...... نیچے خاموشی سے بہتا ہوا وسیع وعریض دریا، جس کے دھیمے بہاؤ میں ڈوبنے سے بچنے کے لئے چھٹپٹاتی ہوئی ایک ناسمجھ دوشیزہ......محبت کی ہاری...... جذبات کی رو میں بہہ کر اپنی زندگی کو داؤ پر لگانے کے بعد پچھتاتی ہوئی۔ اور اب رہ رہ کر بچاؤ کے لئے دُہائیاں دے رہی ہے۔

"خدا کے لئے مجھے بچاؤ......ناؤ والو میں ڈوب رہی ہوں۔ مجھے بچالو۔"

مگر وہاں کوئی نہیں جو اُس کی سُنے۔ سبھی نیند کے جھونکے لے رہے ہیں۔ خوابوں کی دنیا کی بھول بھلیوں سے نکلنا شاید کسی کے بس میں نہیں...... کہیں کہیں آواز سُن کر آس پاس کے آوارہ کُتے بھونکتے ضرور ہیں۔ بھونکنا اُن کی عادت ہے......اور وہ بدنصیب......کبھی دریا کی دھیمی روانی میں بہتی جاتی ہے۔ کبھی نیم گرداب میں پھنس کر چکر کھانے لگتی ہے۔

پُل کی لگ بھگ چالیس فٹ اونچائی سے دریا میں کودتے وقت اُس نے ایک پَل

کے لئے بھی نہ سوچا تھا کہ موت وحیات کے درمیان یوں لٹک کر رہ جائے گی ...... وہ تو ایک ہی پل میں زندگی کا خاتمہ چاہتی تھی۔ مگر ہوا اُلٹا۔ دریا میں کودتے ہی ویل ویٹ کے دبیز پیرہن میں اتنی ہوا بھر گئی کہ بڑے سے غبارے کی مانند پھول کر اُسے ڈوبنے نہ دیا۔ اب جو خودکشی کو جنون ٹوٹا تو جان کے لالے پڑ گئے۔ زندگی عزیز محسوس ہوئی اور رہ رہ کر بچاؤ کے لئے دہائیاں دینے لگی۔

''مجھے بچاؤ۔۔۔ ناؤ والو۔ خدارا کوئی تو بچالو۔''

سناٹے کو چیرتی نسوانی صدا سُن کر کنارے کے چند کُتے ایک بار پھر مشتعل ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دوسرے کتوں نے بھی ہڑبونگ مچا دیا۔ بھونکنے کی یلغار ایسی کہ اُس کی فریاد نقار خانے کے توتے کی طرح دب کر رہ گئی۔

سچ ہے۔ ارمانوں کے گلشن پر بے وفائی کا سایہ پڑ جائے تو دل کے خزاں آلود ہوتے دیر نہیں لگتی۔ اعصاب پر بدحواسی کا ایسا دباؤ پڑتا ہے کہ کچھ بھی سُجھائی نہیں دیتا ماسوائے اِس کے کہ محبوب کی جان لے لے یا اپنی جان دیدے۔ اور جب محبوب کے گریبان تک ہاتھ نہیں پہنچتا، تب جنونی کیفیت اپنی ہی زندگی کو صفحۂ ہستی سے مٹانے پر تُل جاتی ہے۔

ایسا ہی کچھ اُس کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

یوں تو باصلوٰۃ والدین کی نُورِ نظر ہونے کے ناتے بڑی سادگی پسند اور حجاب کی پابند تھی...... حیادار ایسی کہ بہت کم بولتی۔ ہمیشہ نامحرموں کی نگاہوں سے کنی کاٹ کر نکلتی، مگر ...... جب سے ہایئر سیکنڈری پاس کر کے کالج میں داخلہ لیا تھا، نئے کھیپ کی دوشیزاؤں کا چلبلا پن دیکھ کر اُس کا بھی دل مچل اُٹھا تھا۔

پس ایک اچھی بھروسے مند سہیلی کی چاہ میں جستجو شروع کر دی تھی...... دن گزرتے رہے۔ خوب جانچا پرکھا۔ مگر کوشش کے باوجود کہیں کوئی قابل اعتبار ہمجولی نہ ملی۔

کالج کے ابتدائی دن تھے۔ اکثر وقفہ ظہرانہ کے دوران سبھی طلبا و طالبات کلاسوں

سے نکل کر کینٹین کا رُخ کرتے، یا پھر خورد نوش کے لئے کالج احاطے سے باہر چلے جاتے۔ وہ کہیں نہ بھٹکتی۔ سر جھکائے سیدھے پُر سکون باغ کا رُخ کرتی، ایک جائے خلوت میں بیٹھ کر اپنا لنچ بکس کھولتی اور پردے میں تناول کیا کرتی۔ یہ اُس کے روز کا عمل تھا۔

اُدھر، کچھ ہی دوری پر اُس کا ایک اجنبی کلاس فِلو اکثر سر جُھکائے کِسی کتاب کے مطالعے میں مُستغرق نظر آتا رہتا۔ نوجوان کو مطالعے میں اس قدر مُنہمِک دیکھ کر اُس کے دل میں خواہش مچلتی کہ بھلے ہی کِسی ہم جنس سے شناسائی ہو نہ ہو، اِس محنتی کلاس میٹ کی رفاقت ہی نصیب ہو جائے تو حصول تعلیم کا زمانہ خوشگوار گذرے بلکہ من کا سونا آنگن بھی مہکنا شروع کردے پھر تو بندۂ خدا کو اور کیا چاہیئے۔ پس اُمنگ کے چٹختے ہی بے چین ہو گئی اور اپنے غرض کی تکمیل کے لئے داؤ پیچ آزمانے لگی۔ کبھی مُسکرا کر تو کبھی دلفریب اداؤں کے جلوے دکھا کر لُبھانے لگی۔

اُدھر بھی جوان دل تھا، بے اختیار دھڑ کنے لگا...... عنفوانِ شباب میں ایسے ناز و ادا پہ کون کم بخت نہ پھسلے۔ دل چار چار ہاتھ اُچھلا۔ اور جو ہوائیں موافق ملیں تو متعارف ہونے میں دیر نہ لگائی۔

''ہیلو......''

وہ چونک کر مُڑی۔ اچانک اُس کو خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ رو برو پایا تو سارے شریر میں کرنٹ سی دوڑ گئی۔ حیا کے مارے انگ انگ سے پسینے چھوٹے۔

اس سے پیشتر کہ وہ سنبھل کر کچھ کہتی۔ نوجوان دیدہ دلیری سے بولا۔

''میں دانش۔ آپ کا کلاس میٹ......''

کِسی نامحرم کے سنگ پہلی بار ناتا جوڑنا کِس قدر مشکل عمل ہوتا ہے، اُسے آج معلوم ہوا۔ وہ ہمت جٹا کر بولی۔

''میں نرگس۔۔ نرگس اختر۔''

''بڑا ہی خوبصورت نام ہے۔آیئے نا۔کہیں پارک میں بیٹھتے ہیں۔''

''جج۔جی۔پھر کبھی......''

وہ بوکھلاہٹ میں بہانہ بنا کر وہاں سے کھسک گئی۔

دِن گزرتے رہے۔متواتر ملتے رہنے سے دونوں کے تکلّفات میں کمی آتی گئی۔ یہاں تک کہ ملنا جُلنا معمول بن گیا۔

سورج ٹھیک سر پہ کھڑا تھا۔سائے سمٹ کر قدموں میں آچکے تھے۔

کہ لنچ بریک کے دوران......

پارک میں قدم رکھتے ہی اُس کی نگاہ دانش پر پڑی جو ایک بنچ پر تنہا بیٹھا کسی کتاب کی ورق گردانی میں مشغول تھا۔قریب جا کر مترنم آواز میں پوچھا۔

''ہیلو دانش۔۔۔کب آئے آپ......؟''

آواز سنتے ہی دانش استقبال کے لئے مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

''ہائے نرگس۔just now......ابھی ابھی آیا ہوں۔''

''اور۔۔آتے ہی جناب نے کتاب کھول لی۔!''

''ہاں تو اکیلا بیٹھا کیا کرتا۔''

''تنہائی میں خوب دل لگا کر پڑھنا اچھی بات ہے۔''

''اجی پڑھتے رہنا تو وقت گذاری کا بہانہ ہے۔کالج میں نیا ہوں۔اجنبی ماحول ہے......آپ کے سوا ابھی تک کسی سے پہچان بھی نہیں۔اور پھر باغ کے اِس کونے میں سینیر لڑکوں کی نگاہیں بھی نہیں پڑتیں۔یہاں ریگنگ سے بچا رہتا ہوں۔''

''ارے ہاں، کیا مصیبت ہے۔لڑکے تو لڑکے سینیر لڑکیاں بھی پریشان کرنے سے نہیں چوکتیں۔ناک میں دم کر دیتے ہیں۔''

’’تو کیا۔۔آپ کا بھی اُن سے واسطہ پڑ چکا ہے؟‘‘

’’اور نہیں تو کیا۔؟‘‘

’’بہت ستاتے ہونگے۔؟‘‘

’’انہیں تو بس ستانے کا کوئی بہانہ چاہیئے۔ ہیلو ہائے میں چُوک ہونے پر دُھتکارنا۔جھڑکیاں سنانا۔اور پھر سزا تجویز کر کے پریشان کرنے میں انہیں بڑا مزا آتا ہے۔‘‘

’’یہ تو ہے......ہم سے بھی کبھی فلمی گانے سُنانے کی اور کبھی بندروں کی طرح اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے کی فرمائیش ہوتی ہے۔ میں ابھی تک صرف ایک بار اُن کے چنگل میں پھنسا ہوں۔ بڑے بے مُروّت ہیں یہ لڑکے۔ ذرا بھی رحم نہیں کرتے۔کم از کم سنئیر لڑکیاں تو آپ پر اتنا ظلم نہ ڈھاتی ہونگیں۔‘‘

’’کچھ نہ پوچھیئے۔ہمیں تو ناچنے اور ٹھمکے لگانے تک کی سزا دی جاتی ہے۔اُف کیا مصیبت ہے۔ مجھے تو ڈر لگا رہتا ہے کہ جانے کب کہاں سامنا ہو جائے اور کیا غضب کر بیٹھیں......میں تو ڈر کے مارے نظر بچا بچا کر چلتی ہوں اور سنئیر جونیئر جو بھی ملے، سب کو سلام کرتی گزر جاتی ہوں۔‘‘

’’اِدھر بھی یہی حال ہے۔‘‘ دانش زیرِ لب مُسکراتا ہوا خوش دلی سے بولا۔ ’’خیر فکر نہ کریں۔بس کِسی طرح یہ سال نِکل جائے۔ اگلے سال ہم بھی دوسرے درجے کے سینئروں میں شمار ہوں گے۔تب فریشیرز کے تیئں ہمارا بھی ایسا ہی رویہ ہوگا۔‘‘

’’نا جی نا۔کم سے کم میں تو ایسا نہ کروں گی۔‘‘

دونوں ہنس دیئے۔اُن کی ہنسی بربطہ وطنبورہ کے ترنگوں کی طرح ہوا میں بکھرتی چلی گئی۔

نرگس خوش طبع انسان کی دوستی پا کر مطمئن ہوئی۔ پھر جوں جوں تعلقات بڑھے دانش نے اس کے چہرے کے حجاب کو غیر ضروری بنا دیا۔ وہ تو چاہتی ہی تھی کہ حجاب اُترے

اور دانش روئے تابان دیکھ کر لٹو ہو جائے۔ حجاب اُترا تو سامنے حُسن کی ملکہ نظر آئی۔ گلابی رخسار، بادامی آنکھیں، موتیوں جیسے چمکتے دانت...... اُسکی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں پھر دونوں محبت کی فضاؤں میں پرواز کرنے لگے۔ روز کی ملاقاتوں سے فاصلہ گھٹتے گھٹتے نزدیکی اتنی بڑھی کہ ''آپ'' سے ''تم'' پر اُتر آئے۔

اب کالج میں ہر جگہ...... باغ ہو یا لائیبریری...... دفتر ہو یا پاتھ...... دونوں اِکٹھے نظر آتے۔ یہاں تک کہ کلاس میں بھی مدمقابل بیٹھنے لگے...... یہ بات کلاس کے چند آزاد خیال دوشیزاؤں کو راس نہ آئی۔ وہ مارے حسد کے عداوت پر تُل گئیں۔ اور خوبرو دانش کو بس میں کرنے کے لئے تن من سے طبع آزمائی کرنے لگیں۔ ناز و اداؤں کے جلوئے بکھیرنے لگیں۔ یہاں تک کہ ڈورے ڈالنے کے چکر میں ناموس بھی لُٹا بیٹھیں...... شباب کی اِس بے دریغ دعوت نے دانش کو نرگس کی محبت سے روگرواں کر دیا۔ من موجی بنا تو شراب کا چسکہ بھی لگ گیا۔

بات اچھی ہو یا بُری، لاکھ چھپائے نہیں چھپتی۔

نرگس پر دوست کی متلون مزاجی کا راز کُھلا تو مل کر خوب سرزنش کی۔ تلخ و تُرش لہجہ استعمال کر کے بولی۔

''تمہارے سر میں خنّاس تو نہیں سما گیا۔۔۔ بڑے سیدھے سادھے بنتے تھے۔''

''کیوں کیا کیا ہے میں نے؟'' اُس نے انجان بننے کی اداکاری کی۔

''یہ کہو کیا نہیں کیا ہے۔ وہ جو کلاس کے پچھواڑے میں چوری چھپے ملتے دیکھا ہے، وہ بھی جھوٹ ہے کیا؟...... میں دیکھتی ہوں تو سمجھ بھی لیتی ہوں۔ تم کچھ...... بدل سے گئے ہو۔ مجھ میں دلچسپی نہیں تو صاف کہدو۔ اپنا راستہ بدل دوں گی پھر کرتے رہنا من مانیاں۔''

نرگس کے دھمکاتے ہی اُس کی ہوا نکل گئی۔ گھبرا کر عاجزی سے کہا۔

''ایسا نہ کہو جانِ من۔ وہ جو تم نے دیکھا تھا۔ صحیح ہے۔ وہ مجھ سے کوئی نوٹ مانگ

رہی تھی ...... وہ تو بس لین دین کی بات ......"

"یہ تم جانو۔ آئیندہ بہانے نہیں سنوں گی۔"

کچھ دن دانش محتاط رہا۔ مگر دِل پھینک تتلیاں کب رُکتیں۔ اُس کے گرد منڈلاتی رہیں۔ اُس کا اشتعال بڑھاتی رہیں۔ وہ پھر بہک گیا۔ بے راہ روی کے پر پھر نکل آئے ...... اِس بار طوفان بدتمیزی خوب بڑھا اور کارستانیوں کا چہار سو چرچا ہونے لگا۔ بات اُڑتی ہوئی نرگس کے کانوں میں پڑی تو جل بھُن کر رہ گئی، سر راہ روک کر بپھری شیرنی کی طرح برس پڑی۔

"سُنو۔ تم جیسے گھٹیا انسان کے ساتھ آج سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ آئیندہ بھول کر بھی میرا نام اپنی گندی زبان پر نہ لانا۔ آج سے تمہارا میرا ناتا ختم۔"

دانش اپنی مستی میں شرابور تھا۔ اُس کی دھمکی کو خاطر میں نہ لایا، اور ایک طنزیہ ہنسی کی نذر کر کے نکل گیا۔ وہ بھی غصے میں تلملاتی ہوئی پیر پٹخ کر آگے بڑھ گئی۔

ہر گذرتے دن کے ساتھ دانش کی بے راہ روی کا دائرہ بڑھتا گیا...... بام عروج کو پہنچا تو زوال کے آثار نمودار ہونے لگے۔ قد کاٹھ پر اوس پڑ گئی۔ کئی طرح کی بیماریوں نے گھیر کر ہونٹوں پر چپی کا تالا چڑھا دیا۔ مسکراہٹیں چھِن گئیں ...... نہ کھانے کی رغبت رہی۔ نہ تفریح کا شوق ...... جسم لاغر ہوتا چلا گیا۔

حالت مزید بگڑی تو شہر کے جانے مانے فیزیشن کی خدمات حاصل کیئں۔ طبی جانچ پڑتال ہوئی اور تشخیص مرض کے بعد باضابطہ علاج معالجہ شروع ہو گیا۔

اب جو بیڈ سے لگا تو نرگس کی یاد ستانے لگی۔ اُس کے تیئں بے وفائی کا سوچ کر دل خون کے آنسوں رونے لگا۔

اُدھر دانش کی علالت کی خبر نے نرگس کو بے چین کر دیا۔

وہ بے صبری سے اُس کے کالج آنے کا انتظار کرنے لگی۔کوئی ایک ماہ بعد کالج کا چوتھا سمسٹر شروع ہونے والا تھا......اُسے شامل ہونے کے لئے آنا پڑا۔اب کی بار چال پہلے سے بدلی ہوئی تھی۔ مزاج میں سادگی......آنکھوں میں ندامت......اور گفتار میں شرافت کا وہی پُرانا رنگ چڑھا ہوا تھا۔

نرگس کی نگاہ پڑی تو تڑپ کر قریب آ گئی اور جذباتی ہو کر بولی۔

''میں تمہارے لئے فکر مند تھی......یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے......نہ میں دھمکاتی نہ تمہاری یہ حالت ہوتی۔ مجھے معاف کر دو دانش۔''

''اِس میں تمہاری کوئی خطا نہیں۔میں ہی ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔''

''چلو خدا کا شکر ہے تم ٹھیک تو ہو گئے۔اور یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں بھلا بیٹھی ہوں۔ آج بھی اتنا ہی چاہتی ہوں جتنا کہ پہلے۔میں کل تمہاری تھی۔آج بھی تمہاری ہوں۔''

''اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں نرگس۔''اس کے اندر سے درد بھری آہ نکلی۔

''کیوں بکواس کرتے ہو......کہیں تمہاری نیت بدل تو نہیں گئی۔؟''

''یہ بات نہیں......دراصل گھر والوں نے میری بات کہیں اور چلا دی ہے۔''

''اور تم نے حامی بھر لی۔یہ نہ سوچا کہ ایک پگلی بھی کہیں انتظار کی گھڑیاں گن رہی ہے۔''

''مگر تم تو خود ناتا توڑ گئی تھی۔اسی لئے تو میں اپنے ابا کو منع نہیں کر سکا ہوں۔''

''وہ تو میں غصے میں یونہی بک گئی تھی......دیکھو دانش......تم نے ٹھکرانے کی غلطی کی تو یاد رکھنا میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔''

''کیا بے کار کی بات کرتی ہو۔ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچو......حامی بھرنے کے بعد انکار کر کے ابا کے دل کو ٹھیس پہنچانا ٹھیک ہو گا کیا......ویسے ہی بہت دُکھ دیئے ہیں میں

نے ......اب اور دُکھی نہیں دیکھ سکتا۔بس...... بہت ہو گیا۔تمہارے لئے مجھے بھول جانا ہی بہتر ہے۔تم حسین ہو...... جوان ہو...... مجھ سے بہتر جیون ساتھی پا سکتی ہو۔''

''بس بس۔اپنی بے تکی رہنے دو۔یاد رکھنا...... مجھے کچھ ہو گیا تو اِس کے ذمہ دار تم ہو گے۔'' اور وہ روہانسی ہو کر غصے میں بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

اس دن دانش کی بے رُخی پر وہ دیر گئے تک روتی رہی۔رہ رہ کر بے اعتنائی پر آہیں بھرتی رہی۔اسی پریشانی کے عالم میں شام کی سیاہی پھیلی تو فوراً سیل فون پر نمبر چڑھا کر آخری بار کہا۔

''ہیلو...... میری بات پر تجھے یقین نہیں آیا نا۔تو سُن لو...... آخری بار کہتی ہوں۔تم نے ابھی کے ابھی ارادہ بدل کر مثبت جواب نہ دیا تو آج رات سچ مچ پُل پر سے کود کر اپنی جان دے دوں گی۔۔اور میری موت کے ذمہ دار تم ہو گے۔سُنا تم نے۔''

''بیوقوفی مت کر نرگس۔خودکشی کرنا گناہ ہے۔اپنی زندگی کو اس طرح مٹانے کا تجھے کوئی حق نہیں۔سوچو تو...... تمہارے اس غلط قدم کے بعد تمہارے والدین پر کیا بیتے گی۔انہوں نے کتنے نازوں سے پالا ہوگا۔کیا کیا خواب سجائے ہونگے۔کیا کیا اُمیدیں لگائے بیٹھے ہونگے۔''

''اُن کی چھوڑ۔اپنی کہو۔میں آخری بار پوچھتی ہوں۔بولو، کیا کہتے ہو؟'

دانش اُلجھن کے مارے کوئی جواب نہ دے پایا۔سمجھ میں نہ آیا کیسے روکے۔کیسے سمجھائے۔کچھ دیر وہ جواب کی منتظر رہی، پھر تنک کر بولی۔

''ٹھیک ہے۔تو آج رات پُل پر آکر دیکھ لینا۔وہاں میری موت کے نشان ملیں گے۔سُنا تم نے۔''

اس دوٹوک جملے کے بعد فون بند ہو گیا۔

دانش شش و پنج میں پڑ گیا کہ یہ یونہی گیدڑ بھبکی تھی یا سچ مُچ کی دھمکی۔ہر بیتے پل

کے ساتھ اُس کی تشویش بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ رات کی اِبتدا ہوگئی۔ اُس نے بے چین ہو کر نرگس کا فون کھٹکھٹایا، کوئی سنوائی نہ ہوئی۔ بار بار سل فون کے بٹن دبائے۔ حتیٰ کہ رات کا دوسرا پہر شروع ہوا۔ اس کی بے چینی مزید بڑھ گئی کہ خدانخواستہ کہیں سچ مچ ہی جنون میں آ کر خودکشی کی نہ ٹھانی ہو۔ تبھی جھٹ سے لحاف ایک طرف سرکا دی اور بلاتوقف بیڈ سے اُتر کر دبے قدموں گھر سے نکل گیا۔ ماروتی کار اسٹارٹ کرنے میں دیر نہ لگائی اور تیزی سے مطلوبہ پل پر پہنچ کر اِدھر اُدھر تلاش شروع کر دی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ کہیں کوئی پرچھائی تک نہ تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں بہتے دریا کی اور دیکھا۔ کچھ نظر نہ آیا۔ دریا کی خاموش روانی کسی حادثے کی گواہی دینے پر آمادہ نہ تھی...... پُل کے کناروں پر توجہ مرکوز کی۔ کچھ فاصلے پر نیم تاریکی میں سینڈلوں کا جوڑا اور ململی ڈوپٹہ پڑا ہوا نظر آیا۔ اب تو اُس کی حالت اور بھی غیر ہوگئی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ ان چیزوں کو اُٹھا کر کار میں رکھا۔ اور کسی شکارے کو پانے کی غرض سے دریا کے ڈھلان کی طرف اُتر گیا۔

دریا کے دونوں جانب زمین کے بالائی مُسطح کناروں پر دور تک ایک دوسرے سے جُڑے گنجان مکانوں کا لامتناہی سلسلہ...... نیچے برلبِ دریا ہر دو جانب کھونٹوں سے بندھے چھوٹے بڑے رہائشی ناؤ...... ڈونگے ...... ہاؤس بوٹ، جن کے اندر کی اکثر بجلیاں گُل اور مکین خواب شیرین میں غوطہ زن ہیں۔ کہیں کہیں ہاؤس بوٹوں کے دریچوں سے چھن کر آتی بجلی کی روشنی دریا کی روانی کے محدود سطح آب کو روشن کرتی رہی ہے......

وہ بچاؤ کے لئے مسلسل آہ و بکا کرتی رہی۔

یہ نسوانی فریاد نیم خوابی میں کئی ہانجیوں نے سنا مگر وہ آسیب کے خوف سے لحاف چھوڑ کر اُٹھنے کی جُرات نہ کر پائے۔ اور وہ بدنصیب...... روتی کراہتی ہوئی...... قریب سے بہتی گئی۔ اُس منحوس گھڑی کو کوستی ہوئی، جس گھڑی جان دینے کی ٹھانی تھی۔ اُس بے مروت کی خاطر جس کا حسب نسب جانے بناء دل دے بیٹھی تھی، اِس یقین کے ساتھ کہ ایک دن

اُس کے سنگ خوشحال دنیا بسالے گی...... مگراب...... جلد بازی میں موت وحیات کے درمیاں لٹک کر بچاؤ کی دہائیاں دے رہی ہے۔

دانش نے دریا کنارے اُتر کر شد و مد کے ساتھ چھوٹے شکارے کی تلاش شروع کردی۔ ناؤ، ڈونگوں اور ہاوس بوٹوں کے اغل بغل میں جھانک کر دیکھا۔ کہیں کوئی شکارا بندھا ہوا نظر نہ آیا البتہ دریا کی روانی میں بہت دور لگ بھگ اگلے پُل کے قریب سنّاٹے میں نسوانی فریاد فضا کو چیرتی ہوئی محسوس ضرور ہوئی، آواز سنتے ہی وہ فوراً دوڑ کر سڑک پر چڑھ آیا۔ کار اسٹارٹ کی اور اگلے پُل کی طرف روانہ ہوگیا۔

موت وحیات کے کشمکش میں یکا یک ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت یاد کر کے نرگس کا دل تڑپ اُٹھا اگر چہ اُس نے اماں سے دھبے لفظوں دانش کا تذکرہ کیا بھی تھا مگر چونکہ شوہر ایک مذہبی عابدِ شبِ زندہ دار بندہ خدا تھے، عشق وفریفتگی کو بے حد معیوب اور فحش سمجھتے تھے۔ لہٰذا امّاں اُس سے کہنے پوچھنے کی جرأت نہ کر پائی۔ اور اماں کی کمزوری سے چڑ کر وہ دیوانی قیمتی زندگی کو داؤ پر لگانے کی خطا کر بیٹھی۔

اگلے پل کے قریب پہنچتے ہی دانش کار کنارے کھڑی کر کے تیزی سے دریائی گھاٹ کی طرف اُتر گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں دریا کی روانی کو پرکھتے ہوئے اِدھر اُدھر کھوجنے کی کوشش کی۔ تبھی ایک بار پھر سناٹے کو چیرتی ہوئی پہلے سے واضح نسوانی آواز سنائی دی۔ آواز کہیں قریب سے آئی تھی۔

''خدارا کوئی تو بچالو مجھ بدنصیب کو۔''

اُس نے پھرتی سے ٹارچ کی روشنی آواز کی سمت موڑ دی۔ تبھی دریا کی بیچ روانی میں سطح آب پر ایک بڑے سے غبارہ نما شے کو تیرتا دیکھ کر نرگس ہونے کا یقین کرلیا۔ اب تو شکارے کی تلاش اور بھی تیز کردی۔ کشتیوں کے اغل بغل میں جھانکتے ہوئے دفعتاً یک ناؤ

سے بندھے شکارے پر نظر پڑی ہی تھی کہ بے تحاشہ دروازہ پیٹ پیٹ کر ناؤ کے مکین کو جگانا شروع کیا۔ ذرا سے توقف کے بعد ایک نوجوان مانجھی خمار آلود آنکھیں ملتا گھبرایا ہوا دروازے پر نمودار ہوا۔

''کیا بات ہے برادر۔ خیریت تو ہے؟''

''خیریت ہی تو نہیں بھائی۔ خدارا جلدی سے اپنا شکارا نکالو۔ اُسے ڈوبنے سے بچالو''۔

''کِسے بچانا ہے؟''

''اِدھر۔ پانی میں ایک بدنصیب بہہ رہی ہے۔''

اس سے پہلے کہ وہ پوچھ تاچھ کرتا وہ نسوانی آواز دوبارہ اُبھری۔

''ہے کوئی نیک بندہ جو مجھے بچالے۔''

نوجوان مانجھی نے آواز کی سمت دیکھتے ہوئے جھٹ سے شکارے کا رسہ کھول دیا۔ دونوں شکارے میں اُترے۔ شکارے کو مرکز کی طرف دھکیلتے ہی مانجھی کا چپو برق رفتاری سے چل پڑا۔ قریب ہوتے ہوتے ٹارچ کی روشنی میں نرگس دُھندلی سی دکھائی دی۔ نزدیک پہنچتے ہی اجمل نے جھپٹ کر اُسکا بازو پکڑ لیا۔ پکڑتے ہی پھولے ہوئے پیرہن کی ساری ہوا مانند حُباب بُلبلا کر نکل گئی۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد دونوں اُسے کنارے تک کھینچ لانے میں کامیاب ہوگئے۔ اُس کی سانس اُکھڑی ہوئی تھی۔ دم ذرا سنبھلا تو دانش نے جیب سے کچھ رقم نکالی اور مانجھی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں چاہتا اِس واقعے کی بھنک کِسی کے کانوں میں پڑے۔ لڑکی ذات کا

معاملہ ہے۔تم سمجھتے ہونا۔ یہ خطیر سی رقم تمہارا حق المحنت ہے۔ رکھ لو۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔انسان کی جان بچانا میرا بھی تو فرض ہے۔''

''پھر بھی رکھ لو۔''

''نہیں میں فرض کا مول لے کر خدا کے سامنے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا۔''

''میرے بھائی۔آج کے زمانے میں آپ جیسے فرض شناس بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔خدا اجر عظیم دے۔اچھا تو اجازت دیں......''

نرگس سر سے پیر تک بھیگی ہوئی تھی۔ وہ کچھ شرمائی کچھ ندامت زدہ سی دانش کے ہمراہ گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھتی گئی۔سڑک پر پہنچ کر دانش نے کار کے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''بیٹھو۔''

وہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ چہرے پر موت کے خوف سے اب بھی ہوائیاں اُڑ رہے تھے۔دانش کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

''کیسی احمق ہو تم۔ایسے بھی کوئی اپنی جان کا دشمن بنتا ہے۔''

''تو کیا کرتی میں۔تم نے کنارا جو کر لیا۔''

''میری کوئی بے بسی بھی تو ہو سکتی ہے۔''

''تو کیا میری بے بسی کوئی معنی نہیں رکھتی۔!''

''تم نہیں سمجھو گی......''

''کیوں نہیں سمجھوں گی۔ میں کوئی نادان ہوں کیا؟ بتاؤ بتاؤ کیا مجبوری ہے

تمہاری۔؟‘‘

’’کوئی فائدہ نہیں......‘‘

’’من میں کھوٹ نہیں تو بتانے میں کیا حرج ہے۔‘‘

’’مجھے مجبور نہ کرو نرگس۔ بس اتنا سمجھو کہ میں ایک مریض شخص ہوں۔ اور مریض کے ساتھ زندگی ہرگز خوشگوار نہیں کٹتی۔‘‘

’’بڑا عجب بہانہ ہے۔ میرا امتحان لے رہے ہو۔؟‘‘

’’امتحان ہی سمجھو۔ ایسا امتحان جس میں کوئی کامیاب نہیں ہوتا۔‘‘

’’یہ کیسی پہیلی بُجھا رہے ہو۔ صاف صاف کہونا، بے وفائی کا ارادہ ہے۔‘‘

’’تُم کچھ بھی سمجھو۔ بس میں تُجھے بھری جوانی میں بیوگی کا دُکھ نہیں دینا چاہتا۔‘‘

’’ہائے توبہ۔ یہ میں کیا سُن رہی ہوں۔ خدانخواستہ کہیں کینسر تو نہیں تمہارے دشمنوں کو۔ اِس کا بھی تو علاج ممکن ہے۔‘‘

’’ہاں ہے تو......مگر۔‘‘

’’مگر کیا......؟‘‘

’’اب تم سے کیا کہوں۔‘‘

’’کہونا کیا بات ہے۔؟‘‘

’’تم مجبور کرتی ہو تو سُنو۔ کوئی بھی سمجھدار لڑکی کِسی ایڈز زدہ شخص کے ساتھ زندگی گذارنا نہیں چاہے گی۔‘‘

جواب سنتے ہی وہ دَھک سے رہ گئی۔ ایسا لگا جیسے دانش نے کانوں میں پگھلا ہوا

سیسہ انڈیل دیا ہو۔تن بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ پل بھر کے لئے دم بخود رہنے کے بعد تڑپ کر پوچھا۔

''تو کیاتم ایچ آئی وی پازیٹو ہو گئے ہو۔؟''

اِس چُبھتے سوال کا کوئی جواب نہ ملا۔ کار میں مسلسل خاموشی چھائی رہی۔ اپنے آرزوؤں کے محل کو یوں مسمار ہوتا محسوس کر کے فرطِ غم میں نرگس کی آنکھیں بے اختیار بھر آئیں۔

دُور کہیں ستاروں کے جُھرمٹ سے ایک بدنصیب تارا ٹوٹ کر آسمان کی وسعتوں میں گُم ہوتا چلا گیا۔

............☆☆☆............

موم کی گُڑیا

جب نیلوفر، جمیل کے سنگ گاؤں سے بھاگی تھی تب اُسے اپنی غصیل اور ہٹلر جیسی سوتیلی ماں کے سِوا کسی کا ڈر نہ تھا۔ ابّا تو چاہتے ہی تھے کہ وہ روز روز کی بے تقصیر مار اور زبانی تازیانے سہتے رہنے کے بجائے بھاگ کر کہیں اور اپنی دُنیا بسالے، اِسلئے کہ وہ سمجھ چُکے تھے بلکہ نیلوفر بھی جان چُکی تھی کہ سوتیلی ماں اب نئے حربوں پر اُتر آئی ہے اور اِسکے لئے ہر آنے والے رشتے میں اپنی بدنیتی سے بگاڑ پیدا کرنے لگی ہے۔

اپنے ارمانوں پر اوس پڑتے دیکھ کر نیلوفر بے بسی کے مارے اندر ہی اندر تڑپتی رہی۔ کُڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک دن دل برداشتہ ہو کر ابّا کی پرواہ کئے بغیر چُپکے سے بھاگ نکلی۔

نیلوفر مجبوراً بھاگی تھی اور اب شہر پہنچ کر ایک متوسط گھرانے کی بہو کہلائی۔ اُسے ایک ہنستا کھیلتا چھوٹا سا پریوار ملا...... ایک ساسوماں...... دواڑھائی سال کی گُڑیا سی بچّی اور شوہر جمیل اب اسکی کُل دُنیا تھی...... جس دِن وہ ان میں شامل ہوئی اُس دن ساسوماں کے ہاتھوں خوب نہاری گئی۔ اِسپند جلا کر نظر اُتاری گئی۔ شرینی چھڑک کر ڈھیر ساری نیک دعاؤں کے درمیان آؤ بھگت ہوا۔

چند ہی دنوں میں جمیل، ساسوماں اور پھول سی کمسِن بچی مُنّی، اُس سے ایسی گھل مل گئی کہ نیلوفر کو اپنی سوکھی زندگی میں نئی بہار کا گُمان ہوا۔ من میں ہزاروں پھول کلیاں کھل اُٹھے۔ اُسکے لئے چولھا چوکا سنبھالنا خوشدلی کا سامان بن گیا...... کہاں گاؤں میں سوتیلی ماں کے تیر ونشتر کی طرح چُبھنے والی جھڑکیاں اور کہاں اِس نئے گھر میں صبح تا شام برسنے والی

خوشیوں کی پھلجڑیاں......

اسکے تو سچ مُچ دِن پھر گئے تھے......ساسوں ماں سگی بیٹی کی طرح پلکوں پر بٹھائے رکھتیں۔ اِس خوشگوار ماحول میں وہ ایسی سرشار رہی، کہ مُنی کا شجرہ نسب کہ وہ کون ہے؟...... کِس کی بیٹی ہے؟...... کے بارے میں، بھولے سے بھی ذہن میں کوئی خیال نہ اُبھرا......وہ جیسے خود کو ہی بھول بیٹھی تھی۔

خوشگوار دن گذرتے رہے۔ ساسوماں ضعیف العمری کے باوجود چاق و چوبند تھی......

......البتہ کبھی کبھار مُنی بخار میں مُبتلا ہوتی یا ذرا سا سینے میں درد کی شکایت کرتی تو فکر و تشویش کے مارے ماں بیٹے بھاگ دوڑ کرنے لگتے۔ چہروں کا رنگ فق ہو جاتا......

اُن کی حالت دیکھ کر نیلوفیر بھی پریشان ہوتی، مگر جمیل اُسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیتا کہ

''کم سِنی میں احتیاط کرنا ضروری ہے، ورنہ تو ایسی کوئی خاص بات نہیں''......

پھر دونوں ماں بیٹے مُنی کو لے کر ڈاکٹر کے پاس چلے جاتے۔ وہ بھی جانا چاہتی تو اُسے بہانے سے روک دیتے۔

ایسا اکثر ہوتا رہتا اور نیلوفر، جمیل کے سمجھانے پر مُطمئن ہو کر اپنے کام میں جُٹ جایا کرتی......اُسے کِسی خاص بات کے چھپائے جانے کا بالکل بھی احتمال نہ تھا۔

جمیل سرکاری ملازم تھا......اُس کے مہینے بھر کی کمائی سے گھر کا گذر بسر بس ہو ہی جاتا تھا۔ اگر چہ گھر میں ضرورت کی ساری چیزیں میئسّر تھیں، مگر پھر بھی ساسوماں کبھی بیکار نہ بیٹھتیں، بلا کی ماہر تھی سوزن کاری میں۔ کارخانے دار سے لائے ہوئے سفید سوتی چادر کے چھاپ پر رنگ برنگی دھاگوں سے ایسی نفاست بھری نقش کاڑھتی کہ چند ہی دنوں میں خوشنما گل بوٹوں چرندوں، پرندوں کا گلستان اُگ آتا اور دیکھنے والے کو ہاتھوں کی ہنر مندی سے

زیادہ مشین کی کاریگری کا گمان ہونے لگتا۔ اِس ماہرانہ ہنر مندی کے بدلے اُسے اچھی خاصی اُجرت ملتی تھی۔ یہ پیسے مُنی کی ضروریات اور علاج معالجے کیلئے الگ سے سنبھال کر رکھے جاتے۔

نیلوفر نے بھی ساسوماں سے کشیدہ کاری سیکھ لی اور جب دھیرے دھیرے ماہرانہ صلاحیت کی حامل ہوگئی تو خود بھی کارخانے دار سے چادریں لا لا کر کاڑھنے لگی...... اَن پڑھ ہونے کے ناتے اس کام کو کرنے کے سِوا کمائی کی دوسری صورت ہی نہ تھی۔

اِس کام سے پہلی آمدن ہوئی تو خوش ہوکر ساسوماں کی خدمت میں پیش کردی، مگر ساسوماں نے بہو کی اُجرت کو یہ کہہ کر ہاتھ نہ لگایا کہ......

''کبھی نہ کبھی آڑے وقت میں تمہارے کام آئے گی۔''

بلکہ بیٹے سے کہہ کر مقامی بنک میں اُسکے نام کا کھاتا بھی کھُلوا دیا۔

بس پھر کیا تھا وہ ہمیشہ سیونگ سِلپ جمیل سے لِکھوا کر لے جایا کرتی اور بنک میں جمع کرنے کے بعد اگلے دِن دوبارہ جا کر اپنے پاس بک میں درج کروا آتی......

وقت گذرتا رہا۔

کڑی محنت سے اُس کے بنک کھاتے میں اچھی خاصی رقم جمع ہوتی رہی۔

ایک دن صبح کا وقت تھا۔

نیلوفر کچن کے کام میں جُتی تھی۔ ساسواماں نے سفید چادر پر آخری نقش کاڑھنے کے بعد اِسے تہہ کرلیا اور اُٹھا کر چلتی ہوئی بولی۔

''بہو، میں چادر لوٹانے کارخانے دار کے گھر جا رہی ہوں۔ جلدی لوٹ آؤں گی۔''

''جی ساسوماں۔'' کچن سے اُبھرتی نیلوفر کی مترنم ہمکاری سُن کر ساسوماں اطمینان سے چلی گئی۔

اِدھر جمیل کے دفتر جانے کا وقت ہو چُکا تھا، وہ بھی تیار ہو کر اُٹھا اور مُنی کے نرم و نازک گالوں کو شفقت سے چومنے کے بعد باہر سے ہی پکار کر آگاہ کرتا ہوا بولا۔

''نیلوفر...... میں بھی نکلتا ہوں۔مُنی کا خیال رکھنا۔اور یہ قہوہ کی پیالیاں سمیٹ لینا۔''

''جی اچھا۔آپ بے فکر چلے جایئے۔ میں کچن سے فارغ ہوتے ہی سنبھال لوں گی۔''

''او کے...... بائے بائے مُنی۔''

جاتے جاتے جمیل نے مُنّی کو فلائینگ کِس دی۔

اُس نے بھی بائے بائے ......ٹاٹا......'' کہہ کر ننھے ہاتھوں کو ہوا میں لہرا دیا۔

ساسو ماں اور جمیل کے جاتے ہی مُنی تنہا ہو گئی۔نیلوفر کچن کے کام سے جھٹ پٹ فارغ ہو کر اُس کے پاس چلی آئی۔قہوہ کی پیالیاں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔انہیں سمیٹ کر ایک طرف رکھنے کے بعد اُسے خوش رکھنے کے لئے کھیلنے لگی۔کبھی گُدگُدی کر دی۔کبھی سینے سے بھینچ کر پیار جتایا، کبھی لیٹی حالت میں پیروں پر اُٹھا کر جھلانے لگی۔

اس طرح مستیاں کرتے کرتے اچانک مُنی کے منہ سے ایک ایسے راز کا انکشاف ہوا جِسے جان کر وہ بھونچکی رہ گئی۔گویا کہ سر پہ آسمان ٹوٹا۔پیروں تلے کی زمین کِھسکی۔اسلئے کہ مُنّی مستی کی آڑ میں خوشی سے کلکاریاں مارتی اچانک بولی تھی۔

''تم بالکل میری اصلی اماں جیسی ہو۔''

''اصلی امّاں......!''

یہ الفاظ اسکے لئے حیران کُن تھے۔وہ چونکتی ہوئی متوجہ ہوئی تو مُنی توتلی زبان میں بولی۔

''ہاں......وہ بھی مجھے تمہاری طرح خوب پیار کرتی تھی۔''

نیلوفر نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

''تو اب کہاں ہے تمہاری امّاں......؟

''ابا کہتے ہیں وہ خدا کے گھر گئی ہے۔''

''اور تمہارے ابّا کون ہیں......؟

''دادی کہتی ہیں میں آپ کے سامنے ابا کو ابّا نہ کہا کروں۔''

''کیوں مُنی......؟''

''اسلئے کہ کہیں آپ بھی مجھے چھوڑ کر چلی نہ جائیں۔''

مُنی کی باتوں نے اُسے جھنجوڑ کر رکھدیا۔ وہ اُسے غصّے میں ایک طرف پٹخ کر سوچنے لگی کہ ساسوماں اور جمیل دونوں نے اتنی بڑی حقیقت چھپا کے اُسے دھوکا دیا ہے۔ غصّے اور پچھتاوے کے مارے دانت کٹکٹا کر رہ گئے۔ وہ جل بُھن کر بڑبڑائی۔

''ہائے میں لُٹ گئی برباد ہوگئی۔ ایک رنڈوے نے جھانسہ دے کر میری زندگی خراب کرڈالی۔ سوچا تھا کنوارا ہوگا...... یہ تو رنڈوا نکلا۔ یہ دھوکے باز تو پہلے ہی گل کِھلا چُکا ہے......تو کیا مجھے بٹے سٹے رشتے سے بندھے رہنا ہوگا......نہیں کبھی نہیں میں جُوٹھا پیار برداشت نہیں کرسکتی۔''

بچی کے بارے میں سوچ کر دل میں نفرت کا بھبکا سا اُٹھا، نتھنے پھول گئے۔

اُس کی اندرونی طوفان سے بے خبر مُنی اُسے پیار سے چھونے لگی تو نیلوفر نے بے دردی سے جھٹک دیا اور دھتکار کر پیر پٹختی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ مُنی اسکے رویئے پر بلک بلک کر رو دی۔

کچھ دیر بعد ساسوماں گھر لوٹی تو مُنّی کو بلکتے دیکھ کر بہو سے وجہ پوچھی مگر وہ جواب دینے کے بجائے مُنہ پھلائے بیٹھی رہی۔

شام کو دفتر سے جمیل لوٹا تو اُس کے سامنے چائے کی پیالی پٹخ کر اُسے بھی حیران کر دیا۔ نیلوفر کی بدلی بدلی حالت دیکھ کر دونوں ماں بیٹے گھبرا گئے۔ جمیل نے یہ سوچ کر چپ سادھ لی کہ شاید ساس بہو میں کِسی بات کو لیکر ان بن ہوئی ہوگی۔ لہٰذہ ایک آدھ دن میں اعتدال پر آجائے گی۔ مگر......

ایسا نہ ہوا، اور مُنہ پھلائے رکھنے کا سلسلہ ایسا چلا کہ گھر کی خوشیوں کو اُداسی کی دیمک چاٹ گئی...... بات بات پر وہ جمیل اور ساسوماں سے اُلجھ پڑتی تو دونوں ہمسائیگی میں خجالت کے ڈر سے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھتے۔ مُنی پر برہم ہوتی تو خون کے گھونٹ پی کر اُسے الگ سے پُچکارتے، بہلاتے......اسکی ننھی آنکھوں کے جِھلملاتے آنسوں پونچھ کر سینے سے لگا لیا کرتے۔

نیلوفر کے چڑ چڑے پن سے گھر میں تناؤ بڑھتا گیا۔ بے چینی بڑھتی گئی...... وہ بد دلی کے مارے سب سے الگ تھلگ بیٹھ کر اس خیال سے سوزن کاری کرتی رہی کہ پورے ایک لاکھ روپے جمع ہوتے ہی بنک سے سارے رقومات نکال لے گی، پھر جمیل سے چھٹکارا پا کے اپنے گاؤں واپس لوٹ کر ساری رقم باپ کے قدموں میں ڈال دے گی اور بخشش طلب کر کے ہمیشہ کے لئے وہیں رہ جائے گی۔

ایک دن اِسی اُدھیڑ بن میں اُلجھی ہوئی...... دس ہزار کی موٹی رقم کارخانے دار سے بطور اُجرت لے کر جمیل کو بتائے بغیر اپنے کھاتے میں جمع کروانے بنک پر پہنچی۔ اِس دس ہزار سے اُسکے کھاتے میں لاکھ روپے کا نشانہ پورا ہونے والا تھا۔

بنک کے اندر لوگ مدھو مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ آج وہ جمیل سے سیونگ سلپ لکھوا کر نہ لائی تھی۔ اُس نے یہ سلپ بنک میں ہی ایک اجنبی نوجوان لڑکی سے لکھوالی اور رسپٹ کاونٹر پر دس ہزار روپے جمع کر کے رسید کی پرچی لے لی، اور یہ سوچتی ہوئی گھر لوٹی کہ اگلے دن جا کر پاس بک میں درج کروا لے گی۔ مگر اگلے چند دن وہ گھریلو تناؤ اور

مصروفیات کے باعث بنک پر نہ جاسکی۔

چوتھے دن گئی تو معلوم ہوا کھاتے میں دس ہزار کی رقم جمع ہوئی ہی نہیں ہے......

حد یہ کہ رسّید کی پرچی پر بھی کسی اور ہی لڑکی کا نام نمبر درج تھا...... یہ جان کر وہ سکتے میں آگئی۔ یوں لگا جیسے کسی نے سپنوں کا پٹارا زمین پر دے مارا ہو۔ اِس رقم کے کماتے کماتے اسکی نازک اُنگلیاں تک چھلنی ہوگئی تھیں......

وہ بپتا لیکر منیجر کے پاس گئی۔ منیجر نے غور سے ماجرا سُنا اور فراڈی لڑکی سے متعلق کھاتے کو جانچ پرکھ کر نقص پایا تو فوراً اسے آفس میں طلب کر کے دھتکار لگائی۔ کچھ قانون اور سزا کا ڈر دکھایا۔ بس پھر کیا تھا لڑکی ٹوٹ کر اعتراف جرم کر بیٹھی اور معاملہ حل ہوگیا۔ نیلوفر کے کھاتے میں مطلوبہ رقم ٹرانسفر کروادیا گیا۔

معاملہ سُلجھتے ہی وہ گاؤں واپس لوٹنے کے خیالی تانے بانے بنتی ہوئی پریشان حال گھر لوٹی۔ گھر کی دہلیز پر شوہر سے سامنا ہوا۔ اُسے دیکھ کر جل بُھن گئی اور نفرت سے مُنہ بگاڑ کر جلی کٹی سُناتی باورچی خانے میں داخل ہوئی۔ جمیل بھی اسکے پیچھے کچن میں داخل ہوگیا اور اُسکے جارحانہ رویئے پر تنک کر بہت ہی خوشامدانہ لہجہ اختیار کرتا ہوا بولا۔

''کیا بات ہے نیلوفر...... آج کل بڑی اُکھڑی اُکھڑی رہتی ہو۔ جب دیکھو جلی کٹی سُناتی ہو، کبھی ٹوکتی ہو...... کبھی بھڑکتی ہو...... میری امّاں یا مجھ سے کوئی بھول ہوئی ہے تو صاف صاف کہہ دونا۔ دَم گھونٹ گھونٹ کر تِل تِل مارنے سے پہلے ہمیں ہمارا قصور تو بتادو۔ ہم سے خطا ہوئی ہوگی تو معافی مانگ لیں گے۔''

نیلوفر موقع کی تاک میں تھی، غصّے میں پھنکار کر بولی۔

''معافی مانگنے سے کیا ہوگا۔ تم دونوں ہی قصوروار ہو...... تم لوگوں نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔''

''ہم نے دھوکہ دیا ہے......! کیا دھوکہ دیا ہے ہم نے...... کچھ ہم بھی تو جانیں۔''

”تم دونوں نے پہلی شادی کی بات مجھ سے چھپائے رکھی۔اور یہ کہ یہ منحوس بچی تمہاری بیٹی ہے۔یہ بات بھی مجھ سے چھپائی گئی۔“

”یہ کیسی بات کرتی ہو۔کس نے کہا تجھ سے یہ سب......“

”بات چھپانے سے کبھی چھپتی ہے بھلا...... دیر سویر تو پھوٹ ہی جاتی ہے...... ہائے...... میری پھوٹی قسمت......تم لوگوں نے میری زندگی برباد کرڈالی...... میں یہ سوچ کر خوش تھی کہ ایک کنوارے سے شادی ہوئی ہے......تم تو رنڈوا نکلے، وہ بھی ایک بچی کا باپ......اب میں اِس گھر میں ایک پل نہیں رہ سکتی......میرا فیصلہ ابھی کردو۔ میں اپنا سامان سمیٹ کر چلی جاؤں گی۔“

”باولی نہ بنو نیلوفر...... میں تمہارا قصوروار ہوں۔ اِس میں میری اماں کی کوئی خطا نہیں۔تمہارا میرا معاشقہ چلتے وقت وہ بے چاری وہاں تھی ہی نہیں۔اور پھر یہ بچّی تو معصوم ہے۔اِس کا کیا قصور......تم خود سوتیلی ماں کی سنگدلی سے ہوکر گذری ہو۔ذرا سوچو کتنا دُکھ ہوا تھا تجھے...... کتنی راتوں کو روئی تھی تم...... آج تم بھی ممتا انڈیلنے کی بجائے کٹھورتا دِکھاؤ گی تو اِس کم سن کے ننھے سے دِل کو کتنی ٹھیس پہنچے گی۔ تجھے تو اپنی ظالم ماں کی سنگدلی سے کچھ سبق لینا چاہئے۔خدا کے لئے نیلو......اپنی سوچ بدل دو۔“

وہ اِس کی باتوں سے ذرا سی ڈھیلی پڑ تو گئی مگر اپنا شکوہ دہرانے سے باز نہ آئی......بولی۔

”جو ہے سو۔تم فریبی ہو۔تم نے مجھے جھانسا دیا ہے۔“

”ایسا مت کہو۔یہ سراسر الزام ہے۔میں تم سے کئی بار بولا تھا کہ میرے ساتھ نہیں نبھا پاؤ گی، مگر تم بار بار بھگا لے چلنے کی دہائی دیتی رہی، اپنی سوتیلی ماں کی جارحانہ داستان سُنا سُنا کر مجھے مجبور کرتی رہی۔ایسے میں کیا کرتا میں؟“

ساسو ماں ان دونوں کی گفتگو سے بے خبر دوسرے کمرے میں سوزن کاری میں

مشغول تھی۔ اور مُنی بخار کی حالت میں وہیں بستر سے چپکی بیقراری کے مارے کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی۔

جمیل کی بات سنتے ہی نیلوفر بوکھلا کر بولی۔

''وہ تو ٹھیک ہے...... پر تم نے مجھے اپنی پہلی بیوی کے بارے میں کیوں نہ بتایا تھا۔ چلو وہ خود تو آخرت کو سِدھار گئی، مگر یہ سانپ سی بچی...... اِسے میرے ہی سینے پر مونگ دلنے کے لئے چھوڑنا تھا کیا...... میں اِسے نہیں سہہ سکتی۔''

جمیل پہلے ہی پریشان تھا۔ اسکی بات سے چوٹ سی محسوس کی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''کوئی بات نہیں نیلوفر...... تجھے اِس سے جلدی ہی چھٹکارا مل جائے گا۔''

''تو کیا تم اِسے کہیں بھیج دوگے......؟'' نیلوفر نے چٹک کر پوچھا۔

''میں کیا بھیجوں نیلو...... یہ اپنی قضا سے خود چلی جائے گی۔''

ایسا کہتے ہوئے جمیل کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل پر آرے سے چلے۔ وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔

''......ڈاکٹر کہتے ہیں اسکے دِل میں چھید ہے......نیلوفر...... میری بیٹی جانے والی ہے۔ میں اسے نہیں روک سکتا۔ کوئی اِسے نہیں روک سکتا۔...... وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے دور چلی جائے گی۔ تم جاتے جاتے کچھ دن اُسے ممتا کی بھیک دے سکو تو مجھ پر احسان ہوگا......''

جمیل کی بات سُن کر وہ دھک سے رہ گئی۔ من کا سارا میل پگھل کر آنکھوں کے راستے رخساروں پر بہہ نکلا...... اندر کہیں دبی پڑی ممتا درد کے مارے کلبلائی تو صدمے کے مارے سینہ پیٹ کر ایڑیوں پر بیٹھتی ہوئی گڑگڑانے لگی۔

''ہائے۔ میرے مُنہ میں خاک ...... یہ میں پھول سی بچی کے لئے کیا کیا بک گئی۔''

تبھی کچھ یاد کر کے جھٹ سے کھڑی ہو کر پُر شکوہ لہجے میں بولی۔؟''

''مگر جمیل...... مُنی کی درد کی بات بھی مجھ سے چھُپائی گئی...... آخر کیوں۔؟''

''ہم نہ چاہتے تھے کہ ہماری طرح تم بھی اسکے فکر وغم میں گھلنا شروع کر دو۔''

''اُف...... یہ تم نے کیا سُنا دیا۔ کہدو سب جھوٹ ہے...... مجھے میری کم ظرفی کی ایسی سزا نہیں چاہئے...... خدا کے لئے میری بچی کو بچالو جمیل۔''

اُس نے ہچکیوں کے دوران کندھے پر جھولتے پرس میں سے جھٹ پٹ پاس بُک نکال کر تھماتے ہوئے کہا''

...... یہ لاکھ روپے کیا میری مُنی کے علاج میں کام نہیں آسکتے...... آؤ نا۔ ہم اسکا علاج شہر کے کسی بڑے ڈاکٹر سے کروائینگے۔''

جمیل ٹھنڈی آہ بھر کے دھیرے سے بُد بُدایا۔

''کاش!...... ایسا ممکن ہو نیلوفر......!''

............☆☆☆............

اِستحصال

اور جب ہنگامہ تھم گیا۔ محکمہ برقیات کی چھاپہ مارٹولی تلاشی مہم سرکر کے لوٹ گئی تو تاک میں بیٹھی کم سِن چھ سالہ عاصمہ بیٹی روزن سے مُنہ لگا کر دھیمی آواز میں پکار کر بولی۔

''اماں...... وہ سب چلے گئے۔؟''

آواز سُن کر بدحواس خاتون نے اطمینان کا سانس لیا۔ کپڑے جھاڑتی ہوئی تاریک تہہ خانہ کی گھٹن سے باہر نکلی، اور گاؤن نما پیرہن میں چُھپائے ہوئے برقی ہیٹر کو نکال کر خام اینٹوں سے بنے رَہ دری کے دیوار گیر محرابی طاق پر رکھا، پھر تیزی سے اطراف کا جائیزہ لیتی ہوئی بولی۔

''کہاں گئے تیرے ابا۔۔۔؟''

''وہ بھی اُن کے پیچھے باہر چلے گئے۔''

عاصمہ کا جواب سنتے ہی خاتون بے تحاشہ انگنیا پار کرتی ہوئی پھاٹک کی اور بڑھی۔

کِواڑ کُھلا تھا۔ باہر شام کے سائے میں لاتعداد ہیولے متحرک تھے...... یہ سبھی اڑوس پڑوس کے لوگ تھے، جو چھاپہ مارٹولی کے جاتے ہی حالت سراسیمگی میں محلے کی تنگ و تاریک سڑک پر اُمڈ پڑے تھے...... جابجا چھاپے کا چرچہ تھا...... کہیں چہ میگوئیاں...... کہیں سرگوشیاں ہو رہی تھیں...... کہیں شیخی بگھارتے، آپ بیتی بٹورتے لوگوں کے بیچ اُترے چہرے...... بھری صورتیں...... سبھی اپنی اپنی بپتا سُنانے میں مشغول۔ کوئی خوش تو کوئی اُداس...... شادو ناشاد کا سماں سا تھا۔ اُداسی، برقی ہیٹروں، بوئلروں کی ضبطی کو لے کر تھی...... اور خوشی...... دھڑا دھڑ ضبطی سے برقی روشنی میں ہونے والے مسلسل اضافے کے باعث۔

ویسے جاڑے کے یخ بستہ دنوں میں پانی کی قلت ہی کوئی کم مصیبت نہیں ہوتی کہ پاور ہائیڈل پروجکٹ کے چھوٹے بڑے ٹربائین نیم جان ہوکر برقی پیداوار بڑھانے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ اُس پر گھروں کے ہائی وولٹیج ہیٹروں، بوئلروں کی تیز آنچ، غیر مرئی جونکوں کی طرح برقی قوت کو چوس چوس کر اس قدر اَدھ مُوا کر دیتی ہے، کہ گھر گلیارے تو کیا۔ شاہراہوں کے قمقمے قندیلیں بھی بے نُور ہوکر شرم سے ٹمٹماتے لجاتے رہ جاتے ہیں کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سُجھائی دینے والا سناٹا غیر ترقی یافتہ زمانے کی لالٹینوں اور چراغدانوں کی یاد دلاتا ہے۔

جب تک برقی محکمہ سرکار کی دیکھ ریکھ میں تھا، پاور قانون کی گرفت ڈھیلی پڑی تھی۔ من مانیوں اور دھاندلیوں کا بول بالا تھا۔ یہ اور بات کہ لوگوں کو بجلی کی چوری مہنگے ایندھن کی وجہ سے کرنی پڑتی ہوگی۔ مگر اب جو یہ محکمہ، نجی کارپوریشن کی تحویل میں آگیا تو لوڈشیڈنگ سے چھٹکارے کے لئے قاعدے قانون سخت کر دیئے گئے۔ چھاپہ مار کاروائی اِسی سلسلے کی کڑی تھی۔ شاید یہ مہینے کا چوتھا شبخون رہا ہوگا۔

بڑے پیمانے پر تلاشی کاروائی ہوئی تھی۔ گھروں کے کونے کھدرے کھنگالے گئے۔ ہیٹروں، بوئلروں کی خاصی بڑی تعداد ضبط کر کے لے جائی گئی۔ ملوثین زبردست ہراساں ہوئے۔

وہ خاتون پریشانی کے عالم میں پھاٹک تک نکلی اور وہیں سے کھڑے کھڑے متحرک ہیولوں کے بیچ اپنے شوہر کو تلاشنے لگی۔ پھر جونگاہیں لیمپ پوسٹ کی مدھم روشنی میں ٹولے کے بیچ کھڑے اپنے مطلوب پر ٹھہری تو دیکھتے ہی پھُسپھُسا کر آواز دی۔

"اے جی۔ سنوتو۔ اجی میں نے کہا اِدھر تو دیکھو۔"

لوگوں کی بھنبھناہٹ کے بیچ کسی طرح لرزتی ہوئی مانوس آواز شوہر کی سماعت سے ٹکرائی ہی تھی کہ وہ جھٹ سے آواز کی سمت مُڑا اور اشارہ پاتے ہی مُسکراتا ہوا قریب آ گیا۔

اُس کے چہرے پر فتح مندی کی خوشگوار لکیریں صاف عیاں تھیں۔ وہ چہک کر بولا۔

''رخسانہ تم نے کمال کر دیا۔ یہاں بہتوں کے طوطے اُڑ چکے ہیں۔ محلے میں کافی ضبطی ہوئی ہے۔''

''ہوئی ہوگی......''

رخسانہ نے خوش ہونے کے بجائے بُرا سا مُنہ بنایا۔ وہ تجربات اور وسعت نظر کے میدان میں ابھی بھلے ہی کچی تھی۔ مگر مزاجاً سادگی پسند اور صاف و پاک زندگی گذارنے کی روادار تھی۔ اِس جھنجٹ سے گھبرا کر کافی رنجیدہ ہوئی تھی۔ اس لئے تلملا کر در جواب بولی۔

''شکر کرو، آج بھی ہماری عزت بچ گئی۔ دیکھو جی۔ اب مجھے روز کی یہ آنکھ مچولی منظور نہیں۔ ہر بار پکڑے جانے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ بہت ہوگیا جی بس۔ آئندہ گھر میں ہیٹر کا استعمال نہیں ہوگا۔''

''تو گذر بسر کیسے ہوگی؟''

''میں نہیں جانتی۔ اب تو آپ کو تیل یا گیس کا انتظام کرنا ہی چاہئے۔''

''اری نیک بخت۔ کل ملا کر ڈیپو سے ایک لیٹر تیل ملتا ہے، اتنے سے مہینہ تو نکلتا نہیں، اور اب تو وہ بھی بند ہونے کی حد پر ہے۔ مجھے ہیٹر جلانے کا شوق نہیں۔ پر مہنگی گیس خریدنے کی اوقات بھی تو نہیں۔ ایک اُجرتی مزدور کی کمائی ہوتی ہی کتنی ہے۔ اب بتاؤ۔ ایسے میں ہیٹر کا استعمال کئے بناء کوئی دوسری صورت ہے کیا......؟...... جانِ من۔ میری تنگدستی مجھے ہاتھ کھُلا چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتی۔''

''ہاں مگر، یہ بھی تو سوچو ہر بار اُن کے آدھمکنے سے کتنی اذیت ہوتی ہے......اور پھر محلے کے لوگ بھی تو تھو تُھو کرتے ہونگے۔''

''وہ خود، کون سے دودھ کے دُھلے ہیں۔ کون کتنا پانی میں ہے، میں خوب جانتا ہوں۔ رخسانہ...... میں نے ایمانداری کا دم بھرنے والوں کو رات کے اندھیرے میں بجلی کے

تاروں پر ہُک لگاتے دیکھا ہے۔ وہ بڑے بڑے گھرانے جن کے ہاں کبھی چولھا مشکل سے جلتا تھا، آج رشوتوں اور دھاندلیوں کے بل پر مالدار تو ہو گئے۔ مگر چوری چھپے ہیٹر تپانے کی اُن کی عادت نہیں گئی۔ دیکھا نہیں، اُن کے ہاں سے کتنے ہیٹر بوئیلر ضبط ہوئے ہیں۔ اِن امیروں کو بجلی کے ناجائیز استعمال کی کوئی مجبوری نہیں۔ وہ چاہیں تو گیس ایندھن وغیرہ کا انتظام آسانی سے کر سکتے ہیں۔ مگر ہم ضرورت مند ہیں۔ مجبور نہ ہوتے تو ایسا کیوں کرتے۔''

رخسانہ شوہر کی قلیل آمدن سے باخبر تھی۔ کیا اصرار کرتی۔ پھاٹک کھُلا چھوڑ کر خاموشی سے اندر چلی گئی۔

محلے کے بیشتر صاحب حثیت لوگ، بہو داماد والے، جتنے بھی گھرانے زد میں آئے تھے، یوں پول کھُل جانے سے شرمسار تھے۔ بڑی ہیٹی ہوئی تھی اُن کی۔ ایک وہ تھا۔ اوروں کی نسبت ہشاش بشاش سا۔ رُخسانہ کی سمجھداری سے چوتھے چھاپے میں بھی بچ گیا تھا۔ لوگ حیران تھے کہ یہ شخص آخر اِس بار بھی کیسے بچا۔؟ کچھ لوگوں کے تو حسد بھی ہونے لگا تھا۔

ٹولے میں کھڑے ایک شخص نے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا تھا۔

''یار جمال۔ تم بڑے چُتر نکلے۔ اب کی بار بھی پکڑے نہ گئے۔ آخر بچتے کیسے ہو۔؟ انہوں نے تو چپہ چپہ چھان مارا ہوگا؟''

جمال کو فخر سے شانے اُچکاتے دیکھ کر دوسرا فرد طنزاً بولا تھا۔

''چُتر کیا۔ شاطر کہو۔ ضرور گھر کے اندر کوئی تہہ خانہ ہوگا۔ ورنہ تو اِن حالات میں بچنے کی کوئی صورت ہو ہی نہیں سکتی۔ یا پھر۔ کِسی کرمچاری سے یارانہ گھانٹھ رکھا ہوگا جس سے پل پل کی خبر ملتی ہوگی۔''

''بھیاء۔ میرے شکستہ گھر میں ٹھیک سے ہی رہنے کی گنجائش نہیں، تہہ خانہ کیا ہوگا۔ اور پھر مجھ پھٹیچر سے بھلا کِسی کارندے کا کیا جوڑ۔ میں تو صرف چکمہ دینے کے پیترے آزما کر بچ جاتا ہوں''۔

تبھی ٹولے میں سے ایک کے لب شوخ مُسکراہٹ کے ساتھ پھڑ پھڑائے تھے۔

''بچ کے رہنا بھائی۔ کہیں کِسی دن ساری چترائی دھری نہ رہ جائے۔''

اِس سے پہلے کہ وہ کوئی مناسب جواب دیتا۔ رخسانہ کی پکار کانوں سے ٹکرائی تھی، اور وہ موقع غنیمت جان کر اُس کی اور کِھسکا تھا۔

☆

اگلے چند دِنوں بعد کاروائی مزید سخت کردی گئی۔ پے در پے پڑتے چھاپے...... ملوثین سے جُرمانہ وصول کرنے کے احکامات ...... انتباہ کے طور پر جا بجا چسپاں ہوتے پرچے...... لوگوں کے لئے بلائے بے درماں بن گئے کہ بچنا محال ہوگیا۔ غوغا احتجاج کچھ کام نہ آیا۔ مزاحمت ہوئی تو پولیس کی ٹکڑیاں بلائی گئیں......خوب شکنجا کسا گیا......خوب بے عزتی ہوئی۔

باوقار لوگوں نے رہی سہی ساخت بچانے کے لئے ہیٹر بوئلر کے استعمال سے سدا کے لئے توبہ کرلی۔ مگر عام لوگوں کے اطوار نہ بدلے۔ بدلتے بھی کیسے۔ تنگ دامانی اور گراں بازاری کے مشکل دور میں ایک ہیٹر ہی تو تھا جس سے گذر بسر کی پھٹی چادر میں کچھ کچھ پیوند کاری کا کام ہو جاتا تھا۔ بیچارے جمال اور رخسانہ کو چھاپوں سے ہیٹر بچانے کے نت نئے داؤ پیچ آزمانے پڑتے تھے۔

مگر پھر ایک دِن......

جاڑے کے موسم میں......

رخسانہ عشائیہ پکا کر ہیٹر کے تار منقطع کر کے رسوئی کے کام سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ گلی میں افراتفری مچ گئی۔ چھاپے کی خبر کا بھبکا سارے شہر میں پھیل گیا۔ کارندے گھروں پر چڑھ دوڑے تھے۔ اُن کے پھاٹک نے بھی بجنا شروع کیا۔ پے در پے دستک ایسی کہ کِواڑ دھڑ دھڑائے...... مانو توڑ ہی ڈالیں گے۔

رخسانہ نے گھبرا کر لحاف کے اندر دُبکے جمال کی اور دیکھا جو سردی زکام اور درد کی شُدت سے کپکپا کر مُنہ ڈھانپے دُبکا پڑا تھا۔ اُس نے آگاہی دینے کی ناکام کوشش کی۔ درد اور آرام کی گولی اُسے سلانے کے کام آئی تھی۔ اِس لئے کسی طور نہ جاگا...... دونوں کم سِن بیٹیاں جو ایک کونے میں بیٹھی درسی مطالعے میں مگن تھیں، اِس غیر متوقع حالت سے پریشان ہو کر کبھی ابا کے ساکِت لحاف کی جانب...... کبھی اماں کو بدحواسی کے عالم میں گرم تپتا ہیٹر لئے اِدھر اُدھر بھاگم بھاگ کرتے...... اور کبھی مارے خوف کے دیدیں پھاڑے، رسوئی کے دروازے کی اور یوں دیکھتی رہیں کہ جیسے کوئی پل میں خونخوار درندہ دروازہ توڑ کر اُن پر جھپٹنے والا ہو...... حالانکہ دروازہ رسوئی کا نہیں بیرونی پھاٹک کا بج رہا تھا۔

رخسانہ باہمت خاتون تھی۔ کوئی اور معاملہ ہوتا تو ضرور نبھا لیتی، مگر معاملہ ضبطی کا تھا۔ جرمانہ چکانے کی حیثیت نہ تھی۔ ایسے میں بے اوسان ہو کر چھٹپٹانا فطری عمل تھا۔ کوئی کونہ کھدرا نہ ملا تو مجبوراً دروازے کے عقب میں جگاڑ کرنے لگی۔

عاصمہ سمجھدار بچی تھی، جھٹ سے اماں کو ٹوک کر بولی۔

''وہاں نہ رکھو اماں، وہاں سے تو پہلی ہی نظر میں نکال لیں گے۔''

''تو کہاں رکھوں؟''

''تو جا کے پھاٹک کھول اماں۔ میں کچھ کرتی ہوں۔''

سیب کو دیکھ سیب رنگ ہی تو پکڑتا ہے۔ کیا زمانہ آگیا ہے بچی لڑکپن میں ہی والدین کے نقشِ قدم پر چل پڑی ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی تو رخسانہ معنی خیز نگاہوں سے اُس کی جانب دیکھتی ہوئی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح رسوئی سے نکل بھاگی۔

اب جو جا کر کِواڑ کھولا تو چھاپہ مار ٹولی کے دو کارندے دندناتے ہوئے گُھسے چلے آئے اور سیدھا رسوئی میں جا کر دیوار سے لگے تھری پن ساکٹ کا جائیزہ لینے لگے۔ چھو کر دیکھا تو کافی گرم تھا۔ یعنی ہیٹر ہونے کی صاف گواہی تھی۔ ایک کارندے نے جو بظاہر بجلی

انسپکڑ تھا، کڑک لہجے میں پوچھا۔

''دروازہ کھولنے میں دیر کیوں لگائی؟''

''جی ہم نے آواز نہیں سُنی۔''

''آواز نہیں سُنی، یا ہیٹر کوٹھکانے لگا رہی تھی۔'' طنزیہ فقرہ کسنے کے بعد انسپکڑ نے اطراف کا سرسری جائیزہ لیا۔ ''سچ سچ بتادو۔ کہاں چھپا رکھا ہے ہیٹر کو؟''

رخسانہ مسکین صورت بنا کر بولی۔

''بھائی صاحب ہماری حالت پر رحم کھائیے۔ خاوند مزدور شخص ہے۔ میں گھریلو خاتون ہوں۔ ہماری چھوٹی چھوٹی بیٹیاں ہیں۔ گذر بسر مشکل سے ہوتی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ پر تم یہ تو جانتی ہونا کہ ہیٹر کا استعمال کرنا جُرم ہے؟''

''ہاں جی۔ جانتی ہوں۔''

تو پھر باز کیوں نہیں آتی۔۔؟''

اُس نے نہایت ہی عاجزی کے ساتھ اپنی مفلوک الحالی کا دُکھڑا سُنانا شروع کیا۔

''بھائی صاحب میرا خاوند اُجرتی مزدور ہے۔ دن بھر بوجھ ڈھو کر اپنا خون جلاتا ہے۔ تب کہیں شام تک کچھ کمائی ہوتی ہے اور پیٹ بھر کھانا نصیب ہوتا ہے، اور جس دن کمائی نہیں ہوتی اس دن فاقے لگتے ہیں۔ یہ دیکھئے نا۔ میرے گھر کی خراب صورتحال سے آپ کو ہماری تنگدستی کا اندازہ ہوجائے گا۔ ہم غریب ہیں۔ تنگ ہاتھ ہیں۔''

انسپکڑ نے کوئی اہمیت نہ دی، اس لئے کہ عُذرات اور حیلے بہانے ہر گھر کی کہانی تھی۔ اس بیچ لائین مین خاموشی سے چپہ چپہ کھنگالتا رہا۔ طاقوں کے اوپر...... بڑے برتنوں کے نیچے......اور جب دروازے کے عقب میں جھانکنے لگا تو رُخسانہ کی جان ہی نکل گئی کہ اب پکڑی گئی۔ مگر جب وہ خالی ہاتھ لوٹ کر مایوسی کے عالم میں یقین کے ساتھ بولا کہ۔

''ہیٹر کا کہیں سراغ نہیں۔'' تب اس کی جان میں جان آ گئی۔ لائین مین مزید بولا ''مگر ساکٹ تو اب بھی گرم ہے۔ اِس کا مطلب ہیٹر جہاں بھی ہے اب بھی آگ اُگلتا ہوگا۔''

رخسانہ کی بھی حیرت کی انتہا نہ رہی یہ سوچ کر کہ دروازے کے عقب سے ہیٹر نکال کر عاصمہ نے آخر کہاں چھپایا ہوگا۔ یا پھر لائین مین نے حالت زار پر رحم کھا کر عمداً نظرانداز کر دیا ہو۔

ابھی چھان بین چل ہی رہی تھی کہ انسپکٹر کی نگاہ لحاف پر پڑی۔

''کون ہے اِس بستر میں۔۔۔؟''

''جی میرا شوہر ہے۔۔صبح سے ہی بیمار ہے۔''

اچھا تو، تم ایسا کرو ہیٹر نکال کر ہمارے حوالے کر دو۔ ہم جُرمانہ کئے بغیر چلے جائیں گے۔''

''کہاں سے لاؤں بھائی صاحب۔ آپ ہماری بے بسی سمجھئے نا۔''

وہ روہانسی ہوگئی۔ انسپکٹر ٹوک کر بولا۔

''تمہارے اِس ساکٹ کی گرمی سے ہیٹر ہونے کی صاف گواہی مل رہی ہے۔ چھو کر دیکھو اب بھی گرم ہے۔''

بچیاں پریشانی کی حالت میں کبھی ساکٹ اور کبھی انسپکٹر کی جانب دیکھتی رہیں۔ رخسانہ نے کھسیا کر جواب دیا۔

''اس میں تو ہر وقت جانے کیوں آگ سا بھرا رہتا ہے۔''

خاتون کی سادگی پر لائین مین کی ہنسی چھوٹی۔ اِس سے پہلے کہ انسپکٹر ڈانٹ پلاتا، بستر کی ہلکی جنبش دیکھ کر اُس کی انسانیت جاگ اُٹھی اور وہ لہجہ بدل کر ازراہ ہمدردی بولا۔

''لگتا ہے تمہارا شوہر بہت بیمار ہے''

''ہاں جی۔آج مزدوری کے لئے بھی نہیں جاسکا ہے۔''

''کسی ڈاکٹر کو دِکھایا نہیں؟''

''ہماری اتنی اوقات کہاں۔بس درد کی گولی کے ساتھ قہوہ پلا کر سُلا دیا ہے۔''

تبھی سُوتی دھویں کی ہلکی سی بُو سے اُس کی چھٹی حِس بیدار ہوگئی۔اور وہ سونگھتا ہوا بولا۔

''یہاں کچھ جل تو نہیں رہا۔''

''نن۔نہیں تو۔'' مہین سی بُو اُس نے بھی محسوس کی ،مگر وہ جھٹ سے نفی میں سر ہلاتی ہوئی ہکلا کر بولی۔''مم۔مجھے تو محسوس نہیں ہورہی۔''

لائن مین کے نتھنے بھی پھڑ پھڑائے۔اس نے بھی تائید کی۔

''ہاں ہاں کپڑا جلنے کی بُو مجھے بھی آرہی ہے۔کہیں کسی کی کانگڑی تو نہیں پلٹی؟''

اُسی دم لحاف کے محرکات نے اُس کا دھیان اپنی طرف کھینچا۔اب تو وہ اور پریشان ہوگئی اور ہڑ بڑی میں ہاتھ ملتی ہوئی بولی۔

''جی ہاں۔۔جی نہیں۔مم۔میں دیکھتی ہوں''۔

''ہاں ہاں دیکھو۔کہیں کوئی جُھلس نہ جائے''

انسپکڑ دال نہ گلتے دیکھ کر واپس جانے کے لئے مُڑا تو رخسانہ نے راحت سی محسوس کی ،مگر اُس نے جاتے جاتے متنبہ کرتے ہوئے کہا۔

''یاد رکھنا۔قانون کے لحاظ سے چوری چھپے ہیٹر کا استعمال کرنا سراسر جُرم ہے۔''

''جی۔۔جی ہاں۔''

کارندے اتنے ناسمجھ نہ تھے کہ دال میں کچھ کالا ہونے کی بات نہ سمجھتے ،مگر کسی

مصلحت کے تحت رسوئی سے نکل گئے۔ رخسانہ جلدی میں اُن کے پیچھے صرف انگنیا تک جاکر پلٹی اور تیز تیز قدموں کے ساتھ رسوئی میں لوٹ آئی اور دروازے کو ہلکے سے دھکا دے کر دم سنبھالتی ہوئی بولی۔

''وہ چلے گئے۔''

اتنا ہی سُننا تھا کہ ہیٹر کی تپش کے مارے جھلستا شوہر چیختا چلّاتا ہوا لحاف کے اندر سے سپرنگ کی طرح اُچھل کر نکل آیا اور لگا بے تحاشہ فرش خاکی پر پچھاڑیں کھانے۔

''ارے بچالو۔ ارے ہائے ہائے جلا ڈالا ظالموں نے۔ ہائے ہائے۔ ارے کوئی تو پانی ڈالو۔ ہائے میری ٹانگیں۔ ارا۔ را۔ را۔ ہائے میں جلا۔''

اس کے پچھاڑیں کھانے اور بندروں کی طرح پلٹیاں کھانے سے رخسانہ گھبرا گئی۔ کمرے میں اودھم سا مچ گیا۔ وہ جھٹ سے بھاگ کر پانی لے آئی اور رونی صورت بنائے اُس کے ٹانگوں پر انڈیلتی ہوئی خود کو کوسنے لگی۔

''ہائے میں مری جاؤں۔ یہ کیسے ہوگیا۔ آپ نے تو کانگڑی ہی نہ اُٹھایا تھا۔''

''اری نامراد۔ اِس تیری لاڈلی عاصمہ نے تپتے ہیٹر کو میرے ٹانگوں میں گھسیڑ دیا تھا۔ ہائے ہائے ظالم نے جلا ڈالا۔''

''اے مردود۔ یہ تو نے کیا کردیا۔ میں بھی تو سوچوں۔ آخر دروازے کے پیچھے سے ہیٹر کہاں غائب ہوگیا۔''

عاصمہ سہم کر دُبکی پڑی رہی، جیسے کوئی ناگ سونگھ گیا ہو۔ ابا کی حالت زار پر معصوم آنکھوں میں آنسوں لرز گئے۔ ماں تو ماں تھی، بیٹی کے لئے سفارش کرنے سے کیسے چوکتی، ٹانگوں پر پانی انڈیلتی ہوئی ممتا بھرے لہجے میں منّت سماجت کرتی ہوئی بولی۔

''معاف کردو جی۔ بچی سے ناسمجھی میں غلطی ہوگئی۔''

''چپ کر خرد ماغ۔ سب تیری خطا ہے۔''

''ہاں ہاں۔ بجا ہے آپ کا غصّہ۔ میں اِسی لائق ہوں۔ جتنا بُرا بھلا کہنا ہے کہہ ڈالو۔ پر آپ کے برداشت کی داد دیتی ہوں۔ ہائے میرے سرتاج۔ کیا صبر پایا ہے۔ خود کو جلا بیٹھے مگر ہیٹر کو اُن کے ہتھے چڑھنے نہ دیا۔ بہت ضبط کیا ہے جی آپ نے۔''

''بند کر یہ بکواس۔ میں جل رہا ہوں اور تجھے داد کی پڑی ہے۔ اری منحوس دیکھ آبلے پڑے ہیں ٹانگوں میں۔ ہٹا دو۔ ہٹا دو۔ اِس آگ کی بھٹّی کو میرے سامنے سے۔''

تبھی غصّے میں اُس نے فرش پر دے مارنے کے لئے ہیٹر کو پورے جنون کے ساتھ سر سے بلند کیا ہی تھا کہ رخسانہ چلاّتی ہوئی اُس پر جھپٹی۔

''ارے ارے کیا کرتے ہو۔ اِس کو تو نہ توڑو۔ یہ بڑے کام کی چیز ہے۔''

اُن کی چھینا جھپٹی میں یکا یک رسوئی کا دروازہ کھڑاک سے کھلا اور وہی دو کارندے جنّات کی طرح آنکھیں پھاڑے نمودار ہو گئے۔

............☆☆☆............

بدنیت

سیلابی قہر نے سارا میدانی علاقہ لپیٹ لیا تو عبور و مرور کے تمام راستے منقطع ہو گئے۔ گاؤں تو گاؤں، شہر کا شہر ڈوب گیا...... پائینی علاقوں میں یک منزلہ مکانات چھت سمیت، جبکہ نشیب وفراز کی سہ منزلہ عمارتیں دو دو منزلوں تک پانی میں ڈوب گئیں۔ گھرانوں اور دکانوں کے خوردونوش معہ سامان واسباب تباہ وبرباد ہو گئے...... کچھ مکانات ڈھہ کر زمین بوس ہوتی دکھائی دیں۔

ایسے میں سرکاری وغیر سرکاری رضا کاروں کی جماعتیں متاثرین کی راحت رسانی کو آگے آئے۔ کچھ تو بچاؤ کی کاروائی میں لگ گئے اور کچھ خوردونوش اور دوائیاں بہم پہچانے لگیں......لوگوں کی حالت اتنی خراب تھی کہ جہاں کوئی امدادی گاڑی امداد بانٹنے کھڑی ہوئی، لوٹ پاٹ کر چھین جھپٹ کر مال غنیمت جان کر لے اُڑے۔ ایسے میں کسی کو خوب ملا۔ کوئی ہاتھ ملتا تر ستارہ گیا۔

ادھر برلب دریا ایک وسیع وعریض آنگن، جو کہ چاروں طرف دو منزلہ عمارت سے گھرا ہوا ہے، اور جس میں پچپاسوں سرحدی مہاجر کنبے عرصہ دراز سے رہائیش پذیر ہیں، میں عمارت کے لوگ کمیٹی صدر کے کہنے پر صلح مشورے کے لئے جمع ہوئے۔

صاحب صدر سب سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ہم سبھی جانتے ہیں کہ سیلاب سے نچلی منزلوں میں رہنے والوں کی حالت کس قدر خراب ہو چکی ہے۔ خوردونوش، اوڑھنا بچھونا، مال واسباب سب تباہ وبرباد ہو چکا ہے۔ ایسے میں بحیثیت صدر میں نے مقامی تھانے میں امداد کی عرضی دی ہے۔ انہوں نے مدد کا وعدہ کیا ہے۔ آپ سے گذارش ہے کہ جب بھی اُن کی جانب سے امدادی گاڑی آئے تو غل غپاڑہ مچائے بغیر ذمہ دار شہریوں کی طرح سارا امدادی سامان لا کر پہلے ایک جگہ اِکھٹا

کرلیں۔ اس کے بعد فرصت پاتے ہی قاعدے سے آپس میں بانٹ لیں گے بلکہ دوسری منزلوں کے مکینوں کو بھی حصہ دار بنائیں گے۔''

''ضرور ضرور...... ایسا ہی ہونا چاہیے'' لوگوں نے تائید کی۔

اگلے دِن تھانے کی جانب سے امدادی گاڑی دومنزلہ کشادہ عمارت کے گیٹ سے آ لگی تو محلے میں ڈھنڈورا پٹ گیا محلے کے لوگ دوڑ بھاگ کر گاڑی پر ٹوٹ پڑے۔ اِس آپادھاپی میں عمارت کے مہاجرین بھی کود پڑھے۔ مہاجروں میں سے ایک بدنیت شخص بڑے بڑے کھوکھے دیکھ کر لالچ میں پڑ گیا اور اپنے بیٹے بیٹیوں کے کاندھوں پر لاد لاد کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ صاحب صدر سمجھاتا منع کرتا رہا، مگر اُس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ جیسے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی تھی۔ مگر باضمیروں نے اُس کی ہدایت کا مان رکھا اور سارا امدادی سامان جس میں بسکٹ، منرل واٹر کے کھوکھے اور خورد ونوش بھرا تھا، اپنے اپنے کاندھوں پر لاد لاد کر صاحب صدر کے کہے ہوئے کمرے میں اکھٹا کرتے رہے۔

کچھ دیر بعد امدادی گاڑی چلی گئی تو ہنگامہ تھم گیا...... اب تو صاحب صدر تلملا کر بولے۔

''کیسا لالچی آدمی ہے۔ کم بخت چیل کوئے کی طرح بڑے بڑے کھوکھے لے اُڑا۔ جیسے قارون کا نہ ختم ہونے والا خزانہ ہاتھ لگا ہو۔ خودغرض نے یہ بھی نہ سوچا کہ برادری میں کمزور بوڑھے، بیوائیں اور یتیم کنُبے بھی ہیں...... ارے مل بانٹ کر کھانے میں جو ذہنی سکون اور ثواب ہے، وہ نفسی نفسی میں کہاں۔''

اُسی دم اُس لالچی شخص کے کمرے کے سامنے چند مرد وزن چہ میگوئیاں کرتے دبی دبی ہنسی ہنستے نظر آئے۔

معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ اُن بڑے بڑے کھوکھوں میں سوائے پاپڑ کے کچھ بھی نہیں...... اور اب سارا کنُبہ خجل کے مارے منہ چھپائے دُبکا بیٹھا ہے۔

............☆☆☆............

سرپھرا

بے اَبر آسمان پُر سلگتے آفتاب کی تمازت سے زمین کی ہر چیز بلا کی تپش اُگل رہی ہے کہ عذابِ سقر کا گمان ہوتا ہے۔ سپارٹ چھت والے کچے مکان کی دوسری منزل کے کمرے میں برقی قوت سے چلنے والا نہ زیرِ چھت پنکھا ہے، نہ فرشی پنکھیا...... ایسے میں لیٹے لیٹے پسینے میں شرابور ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ سوچتا ہوں کہیں جا کر راحت کی سانس لوں، مگر جاؤں بھی تو کہاں۔ ہر طرف گرمی کی بھاپ اُڑ رہی ہے۔ کچھ دیر بعد سورج پہاڑ کے پیچھے چلا جائے گا تب کچھ سوچوں گا۔

اُسے گئے ہوئے چار گھنٹے بیت چکے ہیں۔ بڑا ہی من موجی آدمی ہے۔ بھنوروں کی طرح کلیوں پھولوں کے گرد منڈلاتے رہنے کا ایسا چسکہ کہ لوفر کہیئے تو بے جا نہ ہوگا۔ ہمیشہ چھوکریوں کے خواب وخیال میں غرق رہتا ہے۔ اپنے چھیڑ چھاڑ کے قصّے ...... اپنی رومانی کرتوت کسی اہم کارنامے کی طرح سُنا سنا کر خوش ہونا اُس کی عادت بن چکی ہے۔ میں اِس پانچ مہینے میں اُس سے کافی گُھل مِل چُکا ہوں۔ اس کے عادات واطوار سے واقف ہو چُکا ہوں۔ اُس کی طرح میں بھی نوجوان ہوں۔ مجھ پر بھی شباب کے گل بوٹے کِھلے ہیں۔ مگر مجھے رومانس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اُس کے رومانی قِصّوں میں بھی نہیں ...... وہ پھر بھی چٹخارے لے لے کر اپنے فحشی کرتوت سناتا رہتا ہے۔ ایک چھٹے ہوئے نفس پرست، بدچلن کی نازیبا باتیں ...... واہیات قصّے ...... جواں جذبات کو اشتعال دلانے کے لئے کسی بارود سے کم نہیں ہوتے مگر میں بالکل شانت ہوں مجھے اُس کی باتوں سے گھِن آتی ہے۔ شاید اِس لئے کہ مہذب پریوار سے ہوں ...... اور وہ ...... جانے کِس ماحول میں پلا بڑھا ہوگا۔

کئی بار میں نے اُسے روکا......ٹوکا بھی۔ ...... بھلا بُرا سمجھایا بھی......مگر اُس کم بخت نے میری پند و نصیحت کو خاطر میں نہ لایا۔ اُلٹا نکمّا اور ہجڑا جیسے ناپسندیدہ القاب سے نواز کر میرا انداق اُڑایا۔

خیر...... جو آگ کھائے گا وہی انگارے ہگے گا......وہ واقعی نفس پرست ہے یا بڑ بولا، یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ مگر چھوکریوں سے تپاک سے ملنے کی حرکت کچھ سوچنے پر مجبور ضرور کرتی ہے۔

آج چھٹی کا دن ہے اور وہ......ظہرانے سے ہی غائب ہے......اُسے نئی بستی کی چھوکریوں کے بارے میں جنگل جانے کی بھنک لگ چکی تھی......تبھی تو جھٹ پٹ ظہرانہ ختم کر کے لکڑیاں لانے کے بہانے رسی اور تبر لے کر ڈیرے سے کہتا بھاگا تھا۔

''آج تو گُل کھِلا کے ہی لوٹوں گا۔''

میں کمرے میں اکیلا پسینے سے تر بہ تر لیٹا ہوں......در و دیوار سے آگ برس رہی ہے۔ یہ کمرا اُس کا ڈیرا ہے۔ کافی تنگ ہے...... محض دو یا تین انسانوں کے ٹھہرنے کی گنجائش والا...... پہلے وہ اکیلا تھا...... پچھلے پانچ ماہ سے میں اُس کا ساجھی دار ہوں......اب ہم دو ہیں......ہمارے لئے ٹھیک ہے۔

اُسے یہاں کے محکمہ بلاک میں بحیثیت ڈیلی ویجر مِسّتری، ملازمت کرتے ہوئے دو سال ہو چکے ہیں......اور میں......صرف پانچ ماہ قبل یہاں کی ڈسپنسری کے لئے بحیثیت کمپونڈر ٹرانسفر ہو کر آیا ہوں۔

مجھے یاد ہے،

اپنا بوریا بستر لیکر قصبے میں کرائے کا کمرہ ڈھونڈتے ہوئے اُس سے سامنا ہوا تو مدعا و مقصد جانتے ہی موصوف نے بڑی فراخدلی دکھائی تھی۔ اپنے کمرے کو میرے ساتھ ساجھا کرنے کا اشارہ دیا تھا.. میں نے فوراً قبول کرلیا۔ معلوم تھا پردیس میں وقت گذاری اور

گذر بسر کرنے کا یہی صحیح طریقہ ہے......اب ہم اکھٹے پکاتے کھاتے، دُکھ سُکھ ساجھا کرتے وقت گذارتے ہیں۔

سورج پہاڑ کے پیچھے جا چکا ہے۔

کڑکتی دھوپ کے سمٹتے ہی میں خوشگوار احساس کے لئے تنور نُما ڈیرے سے نِکل کر سپارٹ چھت پر چڑھ آیا ہوں۔

اوپر پہاڑی ٹیکری پر بسے بُدھ وہار کی اور جاتی ہوئی کچی بٹیا ایک بل کھاتی ہوئی ناگن کی مانند صاف دکھائی دے رہی ہے، جس پر سُرخ رنگ کے کپڑوں میں ملبوس دو بودھ بھکشو بڑے ہی شانِ بے نیازی سے خراماں چلے جارہے ہیں......

میری نگاہوں کے سامنے پھیلا قصبہ نہایت مختصر اور شانت ہے۔ یہاں بازار نام کی کوئی بات نہیں۔ کہیں کہیں موٹر یبل کچے رستے پر محدود حد تک اکّا دکّا دکانیں ہیں، جن میں کریانہ، ہوزری، جوتے، ریڈی میڈ گارمنٹس برائے نام مِلتا ہے۔

شہر سے کوسوں دُور بلند و بالا پربتوں کے اِس پار یہ قصبہ اگر چہ وادی کا سب ڈویژن کہلاتا ہے مگر پسماندگی کی وجہ سے یہاں نہ کوئی سرگرمی رہتی ہے نہ چہل پہل......ایک ،دم گھٹا سا ماحول من کو بے چین کئے رکھتا ہے......ہاں کبھی کبھار دِن ڈھلے کچھ سرکاری ملازم چہل قدمی کرتے نظر آتے ہیں، یا پھر لمبے چوغے میں ملبوس لداخی مرد یا عورت گاہ بہ گاہ اپنے مویشی......جیسے کہ سُرا گائے، زومو یا گدھے کو ہانکتے دِکھائی دیتا ہے یا دیتی ہے تو زندگی کے آثار کی جھلک گھڑی بھر کے لئے تن من میں سکون بھر دیتی ہے۔

قصبے کا حدود اربعہ کچھ زیادہ بڑا نہیں۔

قصبے سے ذرا باہر ایک بنجر زمین پر سپارٹ چھتوں والے یک منزلہ دس پندرہ مکانوں کی نئی بستی آباد ہو چکی ہے۔

ذرا دُور لمبے لمبے سخت کانٹوں والے شاخدار درختوں کا ایک گھنا جنگل مُنہ زور

دریائے شیوک کے کنارے ایک چھوٹے سے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ جہاں سے مقامی آبادی کو سال بھرا یندھن مہیار رہتا ہے......جنگل میں بے شمار بھول بھلیاں ہیں جن میں اکثر پریمیوں کی آنکھ مچولی، ٹھٹھا مستیاں ہوتی رہتی ہیں۔ چھُپ چھپا کے محبت کی کہانیاں پروان چڑھتی ہیں......کبھی بے طریق گُل کِھلتا ہے اور کبھی ...... باقاعدہ ازدواجی بندھن میں بندھنے کے فیصلے ہو جاتے ہیں۔ نئی بستی سے یہ خاردار جنگل کچھ زیادہ دُور نہیں یعنی جب چاہا پہنچ گئے۔

میں نے قصبے اور نئی بستی کے مرد و زن کو، جن میں دوشیزائیں...... بیاہتا عورتیں اور دیگر افراد ہوتے......صبح تڑکے یا دِن ڈھلے اپنے یاک اور گدھے ہانکتے جنگل کی اور جاتے دیکھا ہے۔ تب کچھ دیر کے لئے بڑی چہل پہل رہتی ہے......اُن کے جانے کے بعد ماحول میں وہی پہلی کی سی خامشی......اور جب دیر گئے سوکھی لکڑیاں اور خار و خاشاک یاک، گدھوں یا اپنی اپنی پیٹھ پر لادے زن و مرد جنگل سے لوٹتے ہیں تو پل بھر کے لئے پھر سے رونق بخش گمان غالب آتا ہے۔

آج پھر نئی بستی کی عورتیں اور دوشیزائیں جنگل گئی ہیں......میرا ساجھی دار بھی چھٹے ہوئے سانڈ کی طرح اُن کے پیچھے گیا ہے۔ جانے کیا گُل کِھلا کر لوٹے گا۔

جنگل کے ساتھ ہی پہاڑی سلسلے کے دامن میں ریت کا ایک چٹیل سُنسان میدان ہے...... یوں کہیئے کہ چھوٹا سا کِف دَست ریگستان ہے، جس کے لہر دار ٹیلوں کے رتیلے ذرات آئے دِن مغربی دروں سے آنے والی تیز و تُند ہواؤں کے دوش پر اُڑ اُڑ کر ٹیلوں کی جگہیں اور ہیئتیں بدلتے رہتے ہیں۔

اِس نئی بستی میں نوجوانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ پر جتنے بھی ہیں اپنے اَسلاف کی طرح سادگی پسند اور شریف النفس ہیں......بداندیشی اور بداعمالی سے بالکل پاک وصاف......

جبکہ دوشیزائیں......تعداد میں قدرے دُوگنی......اور جوش جوانی سے لبریز ہونے کے باعث شوخ اور چنچل مزاج......چاروں پہر کام کاج کے لئے ہرنیوں کی طرح نشیب و فراز میں چوکڑیاں بھرتے رہنے میں مصروف......یہاں اِن ہی کے دم سے زندگی کی رعنائیاں دلوں میں انگڑائیاں لیتی ہیں۔جنگل میں منگل ہونے کا خوبصورت گمان ہوتا ہے۔ یہ نہ ہوتیں تو شور وشرابے کے عادی شہری پردیسیوں کا اِس دیارِ بے رونق میں جینا دشوار ہو جاتا۔

چھت پر کھڑے کھڑے میری نگاہ دور ایک مقامی نوجوان پر پڑی جو لکڑیوں کے بوجھ سے لدے پھَندے ایک سیاہ رنگ کے یاک کو ہانکتا چلا آ رہا ہے۔قریب پہنچا تو میں نے اوپر سے آواز دی۔

''جولے (سلام) دورجے......باقی لوگ نہیں آئے کیا؟''

اُس نے آواز سُنتے ہی نگاہیں اُٹھائیں اور خوشگوار لہجے میں بولا۔

''جولے (سلام) صفدر جی......ہاں......کچھ لوگ میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ کچھ ابھی لکڑیاں سمیٹ ہی رہی تھیں......اور......اگر اپنے ساتھی کا پوچھتے ہو، تو دل پھینک کو عاشقی سے ہی فرصت کہاں کہ اپنے لئے لکڑیاں چُنے......وہ تو کاٹ کاٹ کر اُن کو دے رہا تھا۔اور مدد کی آڑ میں خوب چھیڑ خانی کے مزے لے رہا تھا۔چھوکریوں کو تو بہت ستایا اُس نے۔''

''اور چھوکریاں......!......وہ کچھ نہ بولیں......؟''

''وہ ٹھہریں مطلبی۔مطلب کی آڑ میں خود بھی اُکساتی رہیں۔بُرا ماننے کے باوجود مستیاں کرتی رہیں......انہیں بناء محنت کے لکڑیاں جو بٹورنا تھا۔''

''یہی تو خرابی ہے درجے......تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔''

''ہاں بالکل......پھر نہ جانے کِسی بڑی بی نے چھوکریوں کے کان میں کیا

پھونک دیا کہ لکڑیاں سمیٹ کر گھٹا باندھنے کے بعد ہنسی مذاق اور چھیڑ خانی کا سلسلہ تیز ہوگیا...... کبھی چھوکریاں اُسے پٹخنی دینے لگیں...... کبھی وہ چھوکریوں پر بھاری ہوگیا۔ چھوکریاں مل کر اُسے بار بار دبوچتے رہے۔ خوب لپٹ جھپٹ ہنسی مذاق ہو رہی تھی...... ہم تو اپنا کام نپٹا کر چلے آئے...... عورتیں بھی میرے پیچھے آ ہی رہی ہیں۔''

''کچھ اندازہ ہے دور جے کہ وہ کب تک لوٹیں گے۔''

''ابھی ہی تو پکڑا پکڑی شروع ہوا ہے...... کون کِس پر بھاری پڑے گا کہہ نہیں سکتا...... مگر کہہ دیتا ہوں...... کسی دِن کوئی ڈائین گلے پڑ گئی تو بہت بُرا ہوگا...... ساری عاشقی واشقی نِکل جائے گی...... آپ سمجھاتے کیوں نہیں؟''

''میں جی ہار کے بیٹھا ہوں۔ وہ قابو میں آنے والا نہیں۔ سر پھرا جو ٹھہرا۔ ہمیشہ ہنسی میں ٹال جاتا ہے......''

''کچھ دنوں پہلے میں نے بھی سمجھایا تھا مگر...... خیر...... معاف کرنا...... میں چلتا ہوں۔''

کچھ ہی پل بعد متوسط عمر کے عورتوں کی ایک ٹولی اپنی اپنی پُشت پر لکڑیوں کا بوجھ لادے گپ شپ کرتی ہوئی آتی دکھائی دی، اُن کی کمر بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔ وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی نئی بستی میں جا کر غائب ہوگئیں۔

اِدھر پَربتوں کے سائے زمین پر اُترنے کے بعد آن کی آن میں کئی نشیب و فراز میں رینگتے ہوئے دُور چلے گئے...... میں نے چھت پر کھڑے کھڑے وقت کا اندازہ لیا۔ کلائی پر گھڑی نہ تھی۔ شفق کی سُرخی جو غروب آفتاب کے بعد ہوتی ہے، شام ہونے کا احساس دِلا رہی تھی۔

''جانے کب عِشق و شباب کی آگ ٹھنڈی ہوگی۔''

اِس خیال سے میرا جوان دِل مچل اُٹھا...... جوانی اُبھن جائے تو قدم کے بہکتے دیر

نہیں لگتی، مگر میں اتنا کمزور نہیں کہ نفسِ امّارہ کو قابو میں نہ رکھ سکوں۔

اب جو شام کے سائے گہرانے لگے تو چھت سے اُتر کر کمرے میں چلا آیا اور سارے وسوسے جھٹک کر عشائیہ پکانے کی تیاری میں جُٹ گیا...... میرا رُخ کھڑکی کی جانب ہونے کی وجہ سے جنگل کا راستہ صاف میری نگاہوں کے نشانے پر تھا۔

وقت گذرتا رہا......

عشائیہ پکنے تک اندھیرا پھیل گیا، مگر وہ نہ آیا۔ جانے کہاں رہ گیا ہوگا۔ میری تشویش بڑھ گئی۔ سمجھ میں نہ آیا کیا کروں۔ کِس سے معلوم کروں۔ نئی بستی کے عورتوں اور چھوکر یوں سے واقفیت نہ تھی۔ بستی کے مردوں کو تو اس بارے میں خبر ہی نہ ہوگا۔

میرے پڑوس کے دو منزلہ مکان میں اور بھی ڈیرے والے تھے۔ کبھی کبھی ہم بورنگ مٹانے کے لئے باہم مل بیٹھ کر گپ شپ کیا کرتے......اور کبھی......تاش کے باون پتوں کی رَمی کھیل کر وقت گذارتے تھے۔ آپس میں ہنسی مذاق بھی ہوتی تھی۔ پر آج اپنے ساجھے دار کی وجہ سے میں دوری بنائے رہا کہ مُبادا خالد سے متعلق کچھ پوچھ نہ لیں۔

رات کی پہلی گھڑی شروع ہوئی تو دل ڈوبنے لگا۔ ذہن میں طرح طرح کے اندیشے سر اُٹھانے لگے......ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کاغذ میں لپٹا ہوا ایک ڈھیلا کھڑکی سے اندر برتنوں پر آگرا۔ میں نے ٹھن کی آواز سے چونک کر پہلے ڈِھیلے کی طرف دیکھا۔ پھر لپک کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔

نیم تاریکی میں ایک ہیولہ تیزی سے نئ بستی کی اور بھاگتا چلا گیا۔ حُلیے سے غالباً چھوکری نما تھی......ڈھیلے پر لپٹا کاغذ پھیلا کر دیکھا تو ایک شکستہ تحریر قم تھی۔

''بابو جی جنگل جا کر اپنے ساتھی کی خبر لیجئے۔''

یقیناً اُس کی کوئی خیر خواہ ہوگی جو رات کی تاریکی میں جوکھم اُٹھا کر باخبر کرنے چلی آئی تھی۔

تحریر پڑھتے ہی انجانی اندیشے کے مارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ظالموں نے جانے کیا دُرگت بنائی ہوگی۔ اور کہیں قتل ہی کرڈالا ہوتو......

اِس منحوس خیال کے آتے ہی نگاہ تیزی سے طاق پر پڑے لمبے سائیز کی ٹارچ پر پڑی۔ جھپٹ کر مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑے باہر نکلا۔ قریب کے مکان پر جا کر صنم وانگچک کو آواز دی۔ وہ میرا اچھا دوست ہے خیر خواہ ہے۔ اُسے نیچے بُلا کر ساری صورت حال بتادی، اور دونوں ایک ایک لاٹھی لے کر ٹارچ کی روشنی میں دوڑتے بھاگتے جنگل جا پہنچے۔

رات کی سیاہ تاریکی......

جنگل کا ہولناک سناٹا......

ہر سو ہُو کا عالم کہ وحشت سے دِل بیٹھ جائے...... مگر ہم ڈٹ گئے۔ ڈر کو پاس نہ پھٹکنے دیا، اِس لئے کہ ہم دو تھے...... کہتے ہیں ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں...... ہم نے تلاش شروع کردی۔ جنگل کی بھُول بھلیوں میں گھُس کر جا بجا دیکھا...... گُو بہ گُو...... ٹہنی بہ ٹہنی ٹارچ کی روشنی ڈالی...... چپہ چپہ چھان مارا۔ کہیں کوئی سُراغ نہ ملا۔ رات کی سیاہ تاریکی ٹارچ کی روشنی کو جیسے نگل رہی تھی کہ کھوجنا دشوار ہو رہا تھا...... ہم نے باری باری نام لے کر پُکارا بھی...... کہیں کوئی سنوائی نہ ہوئی۔

میں نے پریشان ہوکر وانگچک سے کہا۔

''اندھیرے میں کچھ بھی پتہ نہیں چل رہا۔ ظالموں نے اَدھ موہ کر کے جھاڑیوں میں پھینک دیا ہوتو اور بات ہے، ہاتھ آجائے گا...... اور اگر اُن کے ہاتھوں مر کر قتل چھپانے کے لئے کہیں گاڑ دیا گیا ہوگا تو کیسے پتہ چلے گا؟''

''کوئی مُشکل نہیں۔ کھُدی ہوئی جگہ بھُر بھُری اور ذرا اُبھری ہوئی ہوتی ہے۔ ذراسی تیز روشنی ہوتی تو صاف پتہ چل جاتا۔ بھگوان نہ کرے مارا گیا ہو۔''

دونوں پوری شِدّت سے اِدھر اُدھر کھوجتے رہے۔

کچھ ہی دیر میں مشرقی پہاڑ کے عقب سے چاند اُگ آیا تو ساری وادی مدھم روشنی میں قابل دید ہوگئی اور تلاش کا کام کسی قدر آسان ہو گیا۔

جھاڑیوں کو لاٹھیوں سے کھنگالتے ہوئے ہم آگے بڑھے تو کئی جگہ سے گھبرائے ہوئے خرگوش اور چوہے نما سنجوف اُچھل اُچھل کر نکل بھاگے۔

چاند کی روشنی بھلے ہی مدھم تھی مگر تھی حوصلہ بخش۔ پاس کہیں جنگلی بھیڑیا لمبی تان میں رو دیا۔ آواز سُن کر تن بدن میں جھُرجھُری سی دوڑ گئی۔ گھُپ اندھیرا ہوتا تو شائد سانس ہی اٹک گئی ہوتی۔

ہم نے پیڑوں کی موٹی اور بڑی شاخوں پر بار بار ٹارچ کی روشنی ڈالی کہ شائد کہیں لٹکتا ہوا مل جائے......فرش خاکی کو بھی لاٹھیوں اور جوتوں کی نوک سے کھُرچ کھُرچ کر بھُر بھُرا ہونے کا اندازہ کیا مگر ہر جگہ زمین سخت ملی۔

یکا یک دورجے کی نگاہ نیم تاریکی میں قریب کے تنے سے چپکے ہوئے ہیولے پر پڑی۔ وہ فوراً پھُسپھُساتے ہوئے بولا۔

”کہیں وہ خالد تو نہیں......!“

میں چونک پڑا۔ اپنے حواس یکجا کر کے اُس کے پیچھے پیڑ کی طرف دوڑا۔ قریب پہنچ کر دیکھا پیڑ کے تنے سے بندھا ہوا سچ مچ خالد ہی تھا۔ قمیض پہنی ہوئی مگر نچلا دھڑ برہنہ ......ٹانگوں سے پتلون اور ستر سے جانگھیا غائب۔

”اُف......ظالموں نے بڑا ہی ناروا سلوک کیا ہے۔ بے چارے کی کیا حالت بنا رکھی ہے۔“

وانگچک اس کے سراپے کا بہ غور جائزہ لیتے ہوئے کہنے لگا۔

”دونوں ہاتھ اِسی کے پتلون سے تنے کے پیچھے بندھے ہیں۔ ٹانگیں ڈھیلی ہوگئی ہیں۔ سر لٹک رہا ہے......سارا بدن بے جان ہے۔ شائد مرچُکا ہے۔“

''کیا کہتے ہو وانگچک......! ذرا ہلا جھلا کر تو دیکھو۔''

میری تشویش بڑھ گئی۔ اُس نے کندھے ہلائے......آواز دی۔

''خالد۔اے خالد۔ہوش میں آؤ خالد۔''

کوئی حرکت نہ ہوئی۔اُس نے دوبارہ کوشش کی۔

''خالد بھائی۔اے خالد بھائی۔ہوش میں آؤ یار۔''

جواب پھر بھی نہ دارد۔وہ مایوس ہو کر پورے یقین کے ساتھ بولا۔

''صفدر......یہ تو مر چکا ہے۔''

اُس کی خلافِ توقع بات سُن کر میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔دل کانپ گیا۔اب کی بار میں نے کوشش کی۔کندھوں کو بے تحاشہ زور زور سے جھٹکا۔لٹکے ہوئے سر کو اُٹھا کر گالوں کو بار بار تھپکایا۔بار بار چپتیں ماریں۔تبھی مردہ شریر میں ذرا سی جنبش ہوئی ہونٹ لرز اُٹھے۔

''بس کرو۔اب اور نہیں۔مجھے جانے دو۔مجھے جانے دو''

............☆☆☆............

روشن ضمیر

رات کے دوسرے پہر تک سوچ سوچ کر آنکھیں بوجھل ہوئیں تو نیند کے فرشتے نے آکر خوابوں کی دُنیا میں اُچھال دیا...... اور وہ...... بلندیوں کی اور پرواز کرتی ہوئی سرسبز و شاداب وادی میں پہنچ گئی۔

ہر طرف ہریالی......

ہرے بھرے پہاڑی جنگل کے دامن میں خودرو جھاڑیوں اور بوقلمونی پھولوں سے سجا سنورا غیر ہموار پکنک پارک، جس کے ڈھلوان دامن میں شور مچاتی ایک پہاڑی صاف وشفاف ندی گنگناتی بہتی ہوئی...... بہار کے نغمے گاتے چہکتے جنگلی پرندے...... ڈال ڈال پُھدک پُھدک کر مستی لُٹاتے ہوئے...... پھولوں پر رقصِ کرتی رنگ رنگ کی تتلیاں......

......اور اِن سب کے بیچ ہرنیوں کی طرح چوکڑیاں بھرتی، ہنستی کھیلتی اُس کے کالج کی ہم سِن سہیلیاں......

وہ خود بھی دھما چوکڑی میں شامل تھی۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ عادت کے عین مطابق اپنی پردہ داری قائیم رکھے ہوئی تھی۔ گہرے نیلے فراق شلوار پر ہلکا نیلگوں عبیا زیب تن کئے...... سر کے بالوں اور سیب جیسے گالوں کو آسمانی رنگ کی ململی چُنری سے ڈھانپے کمال احتیاط سے کھیلی تھی، اس بات سے بے خبر کہ اس کی اٹکھیلیاں ذرا دُور بالائی سطح پر پیڑ سے ٹیک لگائے بیٹھے، ایک گستاخ نوجوان کی شوخ نگاہوں کے نشانے پر ہے۔

پھر جیسے ہی دُور کی چھوٹی سی بستی میں اذان بلند ہوئی۔ وہ کھیل ادھورا چھوڑ کر وضو

بنانے کی نیت سے قریب کی گھنی جھاڑیوں میں جا گھسی۔ جہاں خلوت میں ایک ننھا سا کلکل کرتا صاف وشفاف جھرنا جھاڑیوں کی جڑوں کو دھوتا ہوا ترائی کی جانب بہہ رہا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اطمینان سے وضو بنایا، جھاڑیوں کے جمگھٹ سے نکل کر نماز کے لئے جگہ ڈھونڈی اور ایک گچھے دار جھاڑ کی آڑ میں جائے پناہ پا کر سر بہ سجود ہوگئی۔

ذرا دُور بالائی سطح پر بیٹھا وہ البیلا نوجوان اُس کے حُسنِ خداداد سے تو پہلے ہی متاثر تھا...... عابدانہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر اور بھی فریفتہ ہوگیا کہ نگاہیں ہٹائے نہ ہٹیں۔

بانو نے نماز سے فارغ ہوتے ہی یہ سوچ کر نگاہیں گھمائیں کہ اِس بیچ کہیں کسی نا محرم کی نظر تو نہیں پڑی...... پھر جو اوپری سطح پر بیٹھے ایک بدتہذیب اجنبی کو کسی شکاری باز کی طرح خود پر شرارت بھری نظروں سے تاکتے پایا تو مارے شرم کے جھینپ کر سمٹ گئی...... وہ غضب کی شوخ نگاہیں...... پگھلے ہوئے سیسے کی مانند سیدھے دِل میں اُتر گئیں۔ بانو غصے میں تلملائی اور جھٹ پٹ آئمہ طاہرین کی زیارت مکمل کر کے چُنری کو سر پر درست کرنے ہی لگی کہ تبھی، بدمست ہواؤں کے ایک تیز وتُند جکڑ نے چُنری کو چھین کر ہوا میں اُچھال دیا...... وہ پریشان ہوکر جھپٹی، چُنری نے جھوم کر پینترا بدلا۔ وہ بھی دیوانہ وار جھپٹتی ہوئی آگے بڑھی۔

اجنبی نوجوان پر پری پیکر کے طریقہ نماز سے شیعہ ہونے کا بھید کھُلا تو وہ کچھ پل کے لئے پس وپیش میں پڑ گیا...... مگر پھر آرزوئے طلب نے ضِد پکڑلی......، حالانکہ یہ طلب ریگستان کے اُس چمکیلے سراب کی طرح تھی کہ جس پر چاند سورج کی چمک سے بھولے بھٹکے پیاسے مسافر کو پانی کا دھوکا ہو جاتا ہے۔

یعنی ناممکن سا معاملہ تھا. وہ دل تھام کر اُس کی اور دیکھتا رہ گیا۔

بانو چُنری کو پکڑنے کی کوشش میں بے اختیار اُچھلتی بھاگتی رہی اور چُنری آس پاس کے پیڑ پودوں میں اُلجھنے کی بجائے اُس کا مُنہ چڑھاتی ہوئی پہلو بدل بدل کر اُڑتی بھاگتی رہی۔ تب اُس کی ناکامی دیکھ کر ہمجولیاں بھی سر دھڑ کی بازی لگانے دوڑیں۔ آس پاس کے

مقامی، غیر مقامی سیاح بھی انسانیت کے ناتے مدد کو اِدھر اُدھر سے بھاگتے چلے آئے۔

چُنری سب کو چکمہ دے کر بے لگام کٹی پتنگ کی طرح مُنہ زورندی کی اور بڑھتی چلی گئی۔

اب جو سارے لوگ جی ہار بیٹھے تو دوشیزہ کو بے بسی کے عالم میں اپنی گوری گوری انگلیاں چٹخارتے دیکھ کر اجنبی نوجوان سے نہ رہا گیا۔ وہ بے چین ہو کر اُٹھا۔ ایک لمبی جست لگائی اور کسی تیز رفتار تیندوے کی مانند لمبی لمبی چھلانگیں مارتا، دیوانہ وار چُنری کے تعاقب میں دوڑتا چلا گیا اور پھسلن بھری ترائی کے باوجود جان جوکھم میں ڈال کر اِدھر اُدھر سے اُس پر جھپٹتا رہا...... یہاں تک کہ کچھ لوگوں کے مُنہ سے اندیشوں کے مارے مُتنبہ کرنے والی آوازیں بھی نکلیں......

''بچ کے بھائی۔''

''آگے مت جاؤ۔ پھسلن ہے۔''

''ارے رُک جا۔ پانی بہالے جائے گا......''

جتنی منہ اتنی باتیں...... پر اُس نے چُنری کو پکڑنے کے جنون میں اُن کے خدشات نظر انداز کر کے جان کی بازی لگادی۔

یکا یک چُنری سطحِ آب سے جاملی وہ بھی پانی میں کود گیا۔ چُنری پانی کی تیز دھاروں میں اُلٹتی پلٹتی منہ زورندی کے بیچوں بیچ تیر کر ایک چٹانی پتھر کی سِل پر جا پھنسی...... اجنبی نوجوان نے جھپٹا مار کر پتھر کی سِل سے چُنری کو اُٹھالیا۔ اُسی دم پانی کی تیز دھارائیں اُسے اُچھال کر ترائی میں لے گئیں۔ اِس خطرناک صورتحال پر تماش بین کے دِل حلق تک اُچھلے۔ سبھی اُسے بے بسی کی حالت میں چھٹپٹاتے دیکھتے رہ گئے۔

اگلے ہی پل تلپٹی میں پہنچنے کے باوجود ہاتھ پیر مار کر کسی طرح کنارے آلگا اور تر بتر ہو کر ہانپتا کانپتا پکنک سپارٹ کی جانب چڑھ آیا۔ اُسے زندہ دیکھ کر خوشی کے مارے لوگوں

کے مُنہ سے کلمہ حق کے نعرے بلند ہوئے۔ واقعی جِس کو رکھے سائیاں مار سکے نا کوئی۔ کچھ لوگ دوڑ کر اُسے کسی ہیرو کی طرح کاندھوں پر اُٹھالائے۔

ایک معمولی سے ڈوپٹّے کی خاطر جان کی بازی لگانے کا جوکھم سچ مچ قابل ستائیش تھا۔

وہ اُس جانباز سے اُسی دم متاثر ہوئی...... اِس خیال سے لرزہ براندام بھی تھی کہ اگر کچھ بُرا ہو جاتا تو وہ منحوس کہلا کر زمانے میں کتنی رُسوا ہو جاتی۔ لوگ سارا قصور اسی کے سر منڈ دیتے۔

پانی سے شرابور وہ نوجوان سیاحوں کے کاندھوں سے اُتر کر تیز تیز دوڑتا ہوا اُس کے قریب چلا آیا اور ذرا دم سنبھالنے کے بعد خوشگوار لہجے میں بولا۔

''سنبھالئے اپنی شرارتی چُنری کو...... ظالم نے آپ کو کافی پریشان کیا......''

اُس نے جھپٹ کر چُنری لے لی، اور رُخ بدل کر جھٹ پٹ بکھرے بالوں کو ڈھانپتی ہوئی احسان مندی کے تحت بولی۔

''شکریہ۔ آپ نے میری لاج رکھ لی...... ویسے...... معاف کیجئے...... ایک معمولی سی چُنری کی خاطر جان پر کھیل جانا عقلمندی نہیں تھی۔ خدانہ خواستہ کچھ ہو جاتا تو لوگ کیا کہتے۔''

''لوگوں کی کِسے پرواہ محترمہ...... آپ اسے میرا جنون...... میری دیوانگی کہئیے۔ مجھے تو آپ سے رابطے کا بہانہ چاہئیے تھا۔''

اُس کے شوخ انداز پر وہ حیا کے مارے سُرخ انگارہ ہوگئی...... من میں آیا کہ کہدے یہ ساری پریشانی تمہاری ہی پیدا کردہ ہے مگر ہونٹوں نے ساتھ نہ دیا۔ البتہ اتنا ضرور بولی۔

''آپ کو پرواہ ہو نہ ہو، مجھے تو لوگ موردالزام ٹھہراتے۔''

''محترمہ، لوگ یہ بھی تو کہتے کہ ایک سر پھرے نے کسی دل پسند کی خاطر اپنی جان قربان کردی۔''

وہ، نہ چاہتی ہوئی بھی ......نہ صرف مُسکرادی، بلکہ اُس کی باتوں سے مرعوب بھی ہونے لگی۔

اجنبی نے حوصلہ پاتے ہوئے مزید کہا۔

''سچ پوچھیئے تو......میں نے ہمیشہ، ہر پل، ہر سانس آپ جیسی خدا پرست جیون ساتھی کی آرزو کی ہے۔ آج اُن ساری لڑکیوں کے بیچ آپ کو حجاب اور عابدانہ رنگ و روپ میں دیکھا تو دل میں اُمید کی کرن چمکی ......اور دیکھئے نا۔ اوپر والے نے بھی اِس ڈوپٹے کو ملنے کا بہانہ بنا دیا...... سچ مُچ آپ جیسی پاک دامن کا ساتھ مل جائے تو زندگی گلزار بن سکتی ہے۔''

بانو اِس کی بے باکی پر تلملا کر مُڑی۔ ابھی اُس کی جانب کھا جانے والی نظروں سے دیکھا ہی تھا کہ شوخ نگاہوں میں عجب سی مقناطیسی کشش محسوس کر کے موم ہوگئی۔ اُسے لگا جیسے وہ کسی غیر مرئی طاقت کے دباؤ میں اُس کی جانب مائیل ہوئی جا رہی ہے۔

تبھی شرما کر بولی۔

''کِسی انجان کا حسب نسب جانے بناء ایسا سوچنا پتھر پر پانی کی لکیر کھینچنے جیسا ہے کہ دھوپ پڑی اور نشان غائب۔''

''اور اگر......اس میں محبتی رنگ شامل ہو جائے تو نشان جم بھی سکتا ہے......خیر جو بھی ہو۔ مجھے گلفام کہتے ہیں۔ حال ہی میں انجینیئر سلکٹ ہوا ہوں۔ اچھی خاصی سیلری ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے والدین نے اپنی زندگی کے فیصلے کا مکمل حق دے رکھا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ آپ راضی ہوں تو امّی ابّا کی بھی دعائے خیر شامل حال رہے گی۔''

’’اور میرے والدین۔؟......میرے بھی تو خیر خواہ ہیں۔سر پرست ہیں۔‘‘

’’یقیناً وہ بھی آپ پر جان چھڑکتے ہونگے۔آپ اظہار کرینگے تو ضرور مان جائیں گے۔‘‘

’’اتنا آسان نہیں ہے......میں آپ مردوں کی طرح والدین کے آگے بے باک ہونے کی جرأت نہیں کرسکتی۔‘‘

’’تو پھر شادی کے بعد پیر پکڑ کر منالیں گے۔‘‘

’’شادی کے بعد......‘‘

شادی کی بات پر وہ چونک پڑی---۔یہ سوچ کر لرز گئی کہ جذبات کی روؤں میں بہہ کر جانے کیا کیا واہیات بک گئی ہے۔کہاں حجاب میں رہنے والی سیدھی سادھی کم سخن۔اور کہاں شکر شکن کے شیرین کلام میں بہک کر احمقانہ کلمات ادا کرنے والی بے حیا......دل میں ندامت کا طوفان سا اُٹھا۔

گلفام اسے خاموش پا کر بے چین ہوگیا۔اُس کا بس چلتا تو دِل چیر کر محبت کی گہرائی دکھا دیتا۔

’’میں آپ کی عابدانہ طور طریقے سے مرعوب ہو کر آپ کے سنگ ایک خوشگوار زندگی جینے کی تمنا کرتا ہوں۔نامت کیجئے۔‘‘

’’دیکھئے،آپ کو مجھ سے ایسی بات نہیں کرنی چاہئے۔اور پھر میرے خاندان میرے مسلک کے بارے میں جانے بناء یہ باتیں فضول ہیں۔‘‘

’’فضول کیوں ہے......خاندان چھوٹا بڑا،امیر غریب میرے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتا......رہا مسلک......تو وہ میں جان گیا ہوں۔اِس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔اس لئے کہ آپ کا بھی دائرۃ المعارف اسلام ہے،اور میرا بھی......آپ بھی ایک خُدا کی عبادت کرتے ہے،میں بھی......آپ بھی قرآن پاک پر یقین رکھتے ہیں......حضرت محمدؐ کو

آخری نبی مانتے ہیں، میں بھی ...... محترمہ کلمہ گو ہونا ہی ایک سچے مومن کی صحیح پہچان ہے۔ اور مسلکی تفاوت ...... یہ تو ایک ذرا سا فرق ہے جو باہمی افہام و تفہیم سے نبھ سکتا ہے۔ پھر بھی وعدہ کرتا ہوں آپ اقرار کرلیں تو مسائل کو کبھی آڑے نہ آنے دوں گا۔"

گلفام کے جذباتی باتوں کی اُس کے دل میں دھاک بیٹھ گئی۔

وقت گزرتا رہا۔ مگر...... وہ لاکھ کوشش کے باوجود اپنے والدین کو رشتے کے لئے راضی نہ کرسکی۔

کچھ دن نا اُمیدی میں گزرے۔ پھر گلفام کے بار بار اُکسانے پر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر جلد بازی میں کورٹ میرج کر ڈالی۔ یوں والدین کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا، اور گلفام سے منسوب ہوتے ہی اپنے والدین اور قرابت داروں کی خوشگوار تعلقات سے محروم ہوگئی۔

خوابوں کی دُنیا میں غوطے کھاتے ہوئے فجر کی اذان سماعت سے ٹکرائی تو چونک کر اُٹھ بیٹھی، دِل کچھ بوجھل سا تھا۔ پھر ایک بھرپور انگڑائی لے کر وضو بنانے چلی گئی۔

☆

اُسے یہ عزوشان والا پریوار نصیب سے ملا تھا۔ گھر کے سارے افراد خوش خلق، عبادت گذار اور شرع محمدیؐ کے پابند تھے۔ یزید کی بربریت اور خانوادہ رسولؐ کی مظلومیت کا بھرپور احساس بھی تھا۔ تبھی تو محرم کے دنوں میں گھر میں اپنوں تو کیا مہمانوں کے لئے بھی گوشت، مرغ، مچھی یا ذائقہ دار چٹپٹا بھولے سے بھی نہ پکتا تھا۔ البتہ طرز ماتم داری سے اختلاف کُھلی ہوئی کتاب کی طرح تھی۔

ساسو ماں تو خودارادیت کے اعتبار سے اور بھی تنگ نظر تھیں۔ بہو کے لئے ہمیشہ مُنہ پھُلائے رہتیں۔ تبھی تو اُسے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا۔

بانو اپنے مائیکے میں اسی طرز ماتم کی رسم کو پوری عقیدت واحترام کے ساتھ مناتی

ہوئی پلی بڑھی پروان چڑھی تھی۔ اس کے نس نس میں خانوادہ رسولؐ کے مظلوموں کی مظلومیت کا درد اس قدر سمایا ہوا تھا کہ محرم کے دنوں میں عزاداری کئے بناء چین نہ پاتی تھی۔

اپنے والدین سے بغاوت کر کے گلفام سے منسوب ہوتے وقت بانو کے خواب و گمان میں بھی نہ تھا کہ بیاہ کے بعد سسرال میں کسی قِسم کی گھٹن کا سامنا ہوگا...... دونوں کہیں باہر سے ہی نکاح پڑھوا کر آئے تھے۔ دور اندیش سُسر نے تو دل پر پتھر رکھ کر فراخدلی دکھائی تھی۔مگر ساسو ماں ارمانوں پر پانی پڑتے دیکھ کر کافی مدت تک ناخوش رہی۔ بلا آخر شوہر کے متواتر سمجھاتے رہنے پر بہ ظاہر پٹری پر آتو گئی۔ مگر...... احساس محرومی کے مارے دِل کا احراق نہ گیا۔

جو بھی ہو، اب بہت کچھ قابو میں تھا۔

زندگی اپنے ڈگر پر رواں تھی کہ نئے اسلامی سال کا پہلا مہینہ محرالحرام آ گیا۔

قرب و جوار میں سوگواری کے سیاہ علم لہرانے لگے۔ دوسرے محلے کے امام باڑہ کو جانے والے رستے کی صفائی ہونے لگی۔ بہشتیوں نے مشکیزوں کے پانی کا، دھول مٹی پر چھڑ کاؤ کر کے رستوں کو صفاچٹ بنا دیا۔ جس سے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو راہ گذرنے والوں کے نتھنوں سے ٹکرا کر اہلبیت رسولؐ کے تئیں جذبہ عقیدت بڑھانے لگی۔ سوگواری کا ماحول بڑھا تو بانو کے جوش جذبات نے سر اُٹھایا۔ اور اب سسرالیوں کے مسلکی تفاوت کے باعث مایوسی کے سائے اُس کے حسین و جمیل رخسار پر صاف ظاہر ہونے لگے۔

وہ سوچنے لگی۔

''اپنی برادری میں بیاہی گئی ہوتی تو کم سے کم ایسی نوبت تو نہ آتی۔ تبھی......

''بیٹی بانو......''

مقابل کے کمرے سے سُسر کی شفقت بھری آواز کانوں میں پڑی۔ بانو ساگ کی ٹوکری باورچی خانے میں چھوڑ کر فرمانبردار بہو کی طرح اُس طرف بھاگی۔

"جی۔آپ نے بُلایا۔"

"ہاں پُتر...... میری عینک ہاتھ نہیں آ رہی۔" انہوں نے آنکھیں ملتے ہوئے بڑے ہی متانت سے کہا"......ابھی اخبار پڑھتے پڑھتے یہیں کہیں رکھی تھی۔"

"جی ابھی دیکھتی ہوں۔"

بانو اُن کی جھریوں بھری آنکھوں کی نمی کو حیرت سے دیکھنے کے بعد سامنے کی میز ٹٹونے لگی۔ دائیں بائیں کے طاقوں پر کھوجا۔ سُسر کے گریبان پر نظر ڈالی۔ مگر عینک تھی کہ کہیں دکھائی نہ دی۔ خود وہ بھی اپنے دودھ کی طرح سفید ریش مبارک پر بے چینی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ اور جب کہیں نہ ملی تو بانو نے یاد آوری کے لئے مودبانہ لہجے میں پوچھا۔

"کہیں آپ کسی دوسرے کمرے میں تو نہ چھوڑ آئے۔؟"

"نہیں بہو۔ میں یہاں سے ایک پل کے لئے بھی نہیں ہلا ہوں۔"

اِدھر اُدھر کھوجتے کھوجتے بانو کی متلاشی نگاہ ٹیبل کے نیچے گئی تو عینک ٹھیک پیروں کے قریب پڑی ہوئی ملی۔ یہ تو اچھا ہوا، پاؤں کے نیچے آ کر چٹخی نہیں۔ ورنہ سُسر بیچارے ٹیسٹڈ عینک کے بناء نابینا جیسے ہو کے رہ جاتے۔ ویسے بھی ساٹھے پاٹھے کے بعد بینائی تو کیا شریر کے ہر انگ میں نقاہت آ ہی جاتی ہے۔

"یہ لیجئے آپ کی عینک...... میرے پیروں تلے آنے کو تھی...... اب سنبھالے رکھیں۔"

"ٹھیک ہے بٹیا۔" انہوں نے ہاتھ میں لیکر رومال سے صاف کرتے ہوئے شفقت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "......اخبار پڑھ کر گریبان میں ڈال دوں گا۔"

کمرے سے نکلتے ہوئے بانو کی نگاہ کھُلے اخبار کے اندرون پنے پر پڑی۔ سامنے امام حسینؑ کی شہادت کا مضمون جلی حروف میں دکھائی دیا۔ اُسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ سسر جی

غالباً اِسی کا مطالعہ کرتے رہے ہونگے ...... وہ کچھ متاثر ہوئی، پھر تاکید کرتی چلی۔

''کِسی چیز کی ضرورت پڑے تو بلا لیجیے۔''

☆

باورچی خانے میں ساسوماں اب بھی چوبی چوکی پر بیٹھی ساگ چُن رہی ہے......
بانو آئی تو اُس کی جانب نظر بھر اُٹھا کر پوچھا۔

''کیوں بُلایا تھا۔؟''

''جی وہ عینک ہاتھ نہیں آرہی تھی ...... میں ڈھونڈ کر دے آئی۔ امام حسینؑ کی مظلومیت کا مطالعہ کر رہے تھے شاید۔''

جواب سُن کر ساسوماں کے ماتھے پر حیرت کے بل پڑ گئے۔ اُچٹتی نگاہوں سے اُس کی جانب گھور کر دیکھا۔ چہرے پر بیزاری کی علامت اُبھر آئی تھی۔ پھر سر کو جھٹک کر دوبارہ ساگ چُننے میں جُٹ گئیں۔

بانو اس کے دِل کی کیفیت بھانپنے کے باوجود کچھ کہے بناء بکھرے پڑے کباڑ سمیٹتی ہوئی سوچنے لگی کہ ہائے......

''میکے میں ابا نے بے میل ازدواجی زندگی میں پیدا ہونے والے مسلکی مسائل سے کِس قدر خبردار کیا تھا۔ کتنا سمجھا کر روکنے کی کوشش کی تھی۔......! ......کاش اُس دم بھیجے میں بات آگئی ہوتی تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتے ......اُف ...... من مانی کر کے کتنی بڑی خطا کر بیٹھی۔ تب امّاں کی دہائی بھی نہ سُنی تھی ...... عقل پر پتھر پڑ گئے تھے کہ سرکش ہو کر گھر سے بھاگ آئی......اور مسلکی چکی کے دوپارٹ میں پھنس کر رہ گئی۔''

سرکشی کی وجہ یاد پڑتے ہی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی......
اُس دِن ......اُس دن ہواؤں کے دوش پر نہ سر سے کھسک کر چُنری اُڑی ہوتی، نہ سر ننگے پگلیوں کی طرح پکڑنے کے لئے دوڑ بھاگ کرنا پڑا ہوتا......تب بے پردگی کی وجہ سے کس

قدر خجالت محسوس کی تھی۔ وہ سچ مچ ایک خوبصورت حادثہ ہی تھا جسے بھلانا ممکن نہ تھا۔

☆

ماہ محرم الحرام کے ابتدائی ایام......

سڑکوں پر جا بجا آویزاں سیاہ کپڑوں کی ماتمی محرابیں......

شہدائے کربلا کی مظلومیت کو اُجاگر کرتے درد و کرب میں ڈوبے منقوش اشعار......

خانوادہ رسول پر بیتے جور و جفا کی یادیں لہرالہرا کر، پھڑ پھڑا کر تازہ کرتے سیاہ پرچم۔ جس کے باعث محبان حسین کے قلوب غموں سے مزید بوجھل ہو رہے ہیں۔

زمین و آسمان کی نزاکت غائب ہے......

کیوں نہ ہوگی۔ اِن ہی ایام میں تو میدان کربلا میں ظالموں نے اہلبیت واطہار رسولؐ پر نہر فرات کا پانی بند کیا تھا......خون ناحق بہا کر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے تھے۔ اس لئے ہر منظر کا سوگوار ہونا لازم ہے۔

اُدھر مسلکی تفاوت میں جکڑی غم سے چُور وہ معصوم بیاپتا پیکر......آج گلفام کے پریوار میں قفسِ دلکش کے اسیر پنچھی کی طرح لاچار و بے بس......عزاخانے کا رُخ کرنے سے عاری......اُس کے ہونٹوں پر پڑا تالا، شہدائے کربلا کے تئیں سسرالیوں کی ضعیف الا عتقادی کا غماز ہے۔

وہ سوچ رہی ہے۔

"کاش! اِسلام کے متعدد فرقے نہ ہوئے ہوتے......اور......عید کی طرح ماتمِ حسین بھی مل کر منایا جاتا، تو آج وہ یوں اضطراب کا شکار نہ ہوتی۔ آج اُسے حد فاصل کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔"

محرم کے چند دن گذرنے کے باوجود بانو نے سسرال میں کوئی سرگرمی نہ دیکھی تو ہر گذرتے پل کے ساتھ اُس کی نفسیاتی بے چینی بڑھنے لگی۔ وہ نہ عزا خانے کو جا پا رہی ہے...... نہ ہی گلفام پر اپنی بے چینی ظاہر کر پائی ہے۔ گھر کے سبھی افراد اُس کی اندرونی کیفیت سے بے خبر اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہیں۔

بانو دل پر پتھر رکھ کر اپنے کمرے میں پڑے پڑے ماضی کو کریدتی رہتی۔ خاموش نگاہوں سے ہنگر پر ٹنگے سیاہ عبیا کو تکتی رہتی۔

چند دن یونہی تذبذب میں گذر گئے۔

پھر ایک دن......

ایک دن خانوادۂ رسولؐ کی محبت میں جذبہ عقیدت نے جوش مارا کہ بے اختیار اُٹھ کر سیاہ عبیا زیب تن کیا......سیاہ اوڑھنی سے سر اور منہ کو ڈھانپ لیا اور کسی سے کچھ کہے بغیر گھر سے نکل گئی۔ ابھی چوکھٹ پار کیا ہی تھا کہ اندر سے ساسو ماں کی آواز سنائی دی۔

''کہاں نکلی بہو۔؟''

بانو ٹھٹھک کر بولی۔

''ساسو ماں۔ کچھ تازہ پھل ملے تو لے آوں۔''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ کوئی جھولا ساتھ لیتی جا۔''

''اماں۔ پولی تھین بیگ تو میوے والے سے ہی مل جاتا ہے۔''

''اچھا، جا چلی جا۔ مگر دیکھ ذرا جلدی لوٹنا۔''

''جی ساسو ماں۔'' کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

پھل خریدنا تو ایک بہانہ ہے۔ دراصل اُس کے قدم عشق حسینؑ میں بے اختیار امام باڑے کی طرف اُٹھے ہیں۔

ساسو ماں نے روشندان میں سے اُسے فروٹ مارکٹ کے بجائے مخالف سمت کو جاتے دیکھا تو من میں کچھ شک گذرا۔ پس وہ بھی جھٹ سے دوشالہ اوڑھے تعاقب کی نیت سے گھر سے نکل آئی۔

امام باڑہ گھر سے کافی دوری پر دوسرے محلے میں ہے۔ بانو چلتی رہی۔ قدم قدم بڑھاتی رہی۔

اَدھے رستے پر مخالف سمت سے آتے گلفام نے پہچان لیا۔۔۔۔۔بانو اُس کی آمد سے بے خبر دیوانگی کے عالم میں قریب سے گذر گئی۔ اُسے اچانک اِس حال میں دیکھ کر گلفام چونک پڑا اور حیرت زدہ سا اُس کے تعاقب میں ہو لیا۔

ساسو ماں بیٹے کو اُسے نہ روک پانے پر ورطہ حیرت میں پڑ گئی، پھر یہ سوچ کر کہ شاید رنگے ہاتھوں پکڑنے کا ارادہ کیا ہو، مطمین ہو کر بڑھتی رہی۔

امام باڑہ کے رستے پر آنے جانے والے عزاداروں کا تانتا بندھا ہے۔ کئی جگہ پیاسوں کے لئے سبیلیں سجی ہیں۔ اِکے دُکے بہشتی بھی اہل عزاء کی پیاس بجھانے کے لئے آہنی سقابہ پُشت پر لادے امام باڑہ کی جانب رواں دواں ہیں۔

گُلفام اپنے ذہن میں مختلف باتوں کی کشمکش کا معرکہ سا لئے اُس کے تعاقب میں چلتا رہا۔ اُن دونوں پر نگاہیں گاڑے ساسو ماں بھی کچھ دوری بنائے بڑھتی رہیں۔

اُدھر بانو چلتے چلتے امام باڑہ کے صدر دروازے پر پہنچی ہی تھی کہ بے ساختہ چھٹی حِس نے قدم روک دیئے۔ وہ اِس خیال سے پریشان ہوگئی کہ اسلام میں شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم رکھنے کی سختی سے ممانعت ہے، اور وہ بناء کسی کو بتائے ہی اتنی دور چلی آئی......دل میں ندامت کا احساس ہوتے ہی یہ سوچ کر لوٹنے کا اِرادہ کیا کہ عشقِ حسینؑ میں تو دِل کا نہاں خانہ ہی آہ وزاری کے لئے کافی ہے۔

ابھی وہ مُڑی ہی تھی کہ گُلفام نے بڑھ کر کلائی پکڑ لی، ایسے جیسے چوری کرتے

پکڑی ہو......وہ گلفام کو اچانک سامنے دیکھ کر بوکھلا گئی اور ندامت کے مارے ہکلا کر بولی۔

''اَ......آپ......یہاں۔؟''

''ہاں۔ تجھے اچانک دیکھا تو چلا آیا۔''

وہ گھبرا کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''میں خود کو روک نہ پائی اور آپ کو بناء بتائے ہی............''

گُلفام اُس کی بات نظر انداز کر کے بغل میں دبا میڈیم سائیز کا فروٹی کھوکھا فرش پر رکھتا ہوا بولا۔

''یہ لو......اہل عزا میں بانٹ کر میرے حصّے کا بھی ثواب کما لو۔''

دُور کھڑی ساسو ماں جو آنکھیں پھاڑے اُن کی اور مسلسل دیکھ رہی تھیں، یکا یک بڑھتی بھیڑ کی آمد و رفت میں جانے کہاں گم ہو گئیں۔

............☆☆☆............

دوہری موت

"ابا کو اکیلے چھوڑ کر تم بھی ہوسٹل چلے گئے......؟

"بھائی جان میری مرضی نہ تھی۔ اباجی نے اصرار کر کے بھیجا ہے تاکہ میں دل لگا کر پڑھ سکوں۔"

"اب تو وہ اور بھی تنہا ہو گئے ہوں گے۔ تمہارے ہونے سے ان کی دیکھ بھال ہوتی تھی۔ کم سے کم کھانا تو پکا کر ملتا تھا۔ "

"ہاں بھائی جان......میں سب کچھ کر لیتا تھا مگر پچھلے کچھ دنوں سے وہ باہر سے کھا کر آنے لگے تھے۔ ہر کام خود کرنے لگے تھے۔ میرے لئے بھی پکا پکایا لاتے تھے...... میں نے بہت منع کیا پر انہوں نے ایک نہ سنی......شاید میرے تعلیمی مصروفیات کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔"

"صحت کیسی ہے ان کی......؟"

"ظاہراً تو ٹھیک ہے...... ذرا کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ ڈیوٹی سے آ کر کھڑکی کے مسند پر بیٹھ کر شام ہونے تک سگریٹ پھونکتے ......اور......رہ رہ کر آہیں بھرتے رہتے ہیں......آپ اماں کو منا کر لانے کی کوشش کیجئے نا"۔

"تم کیا سمجھتے ہو......میں نے کوشش نہیں کی ہو گی۔ میں نے تو آدمی بھی دوڑائے تھے مگر وہ کسی طرح نہیں مانی......وہ کسی کی سنتی ہی کہاں ہے......خیر......تم فکر نہ کرو۔ میں نے مرزا صاحب سے بات کی ہے......وہاں ان کی بہت چلتی ہے......اماں ان کی بات نہیں ٹال پائے گی"۔

O

چار چھ مہینے یونہی گزر گئے۔ آخر کار کوشش رنگ لے ہی آئی۔

کوسوں دور کا سفر تھا۔

شمشادہ بانو شوہر کے سارے گلے شکوے بھلا کر بڑے بیٹے کے سنگ لوٹ رہی تھی......اور بیٹا...... مارے خوشی کے راستے میں آنے والے ہر فرسنگ کے سنگ نشاں کے ہندسے کو گھٹتا دیکھ دیکھ کر بے چین ہوا جا رہا تھا کہ اماں کے آجانے سے گھر میں پہلے جیسی رونق لوٹ آئے گی ......ادھر شمشادہ بانو دوران سفر اپنی ساری خامیوں پر فراخدلی سے غور کرتی رہی ......اپنی من مانیوں، زبان درازی، اور روکھے پن کو یاد کر کر کے شرمسار ہوتی...... اور خود کو کوستی رہی کہ بیکار کا بکھیڑا کھڑا کر کے گھر کا سکون درہم برہم کر دیا...... بھلا میاں بیوی کی نوک جھوک کوئی دل پر لینے کی بات ہے......؟ اب جو اپنی خطاوں کا احساس ہوا تو دل میں ٹھان لیا کہ اب کبھی نافرمانی نہ کرے گی......کبھی شکایت کا موقع نہ دے گی......اپنے اچھے برتاو سے گھر کو جنت بنا دے گی۔

اسی سوچ میں سفر گھٹتے گھٹتے شہر آ گیا۔

ٹیکسی سے اتر کر بیٹے نے بیٹری رکشا لی، جو کچھوے کی چال چلتی ہوئی آدھ گھنٹے میں ایک پھاٹک کے سامنے جا کر رکی......شمشادہ بانو نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا......سامنے وہی مکان تھا جسے اپنی جہالت سے ویران بنا گئی تھی۔ دل میں درد سا اُٹھا...... کچھ افسوس ہوا کچھ ندامت محسوس کی......پھر خود کو سنبھالنے کے بعد......ذرا غور کیا تو محسوس ہوا کہ مکان کے در و دیوار سے اُداسی کے بجائے بشاشت ٹپک رہی ہے۔ اندر کا خوش نما سماں محسوس کر کے دھڑکتے دل کے ساتھ آنگن میں داخل ہوئی ہی تھی کہ لوبان اور اگربتی کی تیز مہک نے نتھوں کی تپشِ بڑھا دی۔ من میں شادو نا شاد کے لڈو پھوٹ پڑے...... یہ سوچ کر کہ شاید مجازی خدا کو آنے کی بھنک لگ چکی ہے......قدم بھاری ہونے لگے ......اب تو حیاء اور احساس ندامت نے جیسے قدم جکڑ لئے۔

''اماں آگے بڑھیئے نا......''

ماں کی ہچکچاہٹ محسوس کر کے بیٹے نے ٹھوکا دیا۔

وہ جھینپ کر بولی۔

''ہاں بیٹا......چلتی ہوں۔''

اوراپنے حواس یکجا کر کے آگے بڑھی اور سرپرائیز دینے کے خیال سے چوکھٹ پر استادہ ہوکر دستک دینے لگی۔

چند پل بعد دروازے کے دونوں پٹ دھیرے سے کُھلے اور زرق برق لباس میں ملبوس ایک سجی سنوری خاتون جلوہ افروز ہوکر شیرین لہجے میں بولی۔

''جی فرمایئے......کس سے ملنا ہے؟''

''آپ کون......؟''

شمشادہ بانو نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا تو وہ لاج کے مارے نگاہیں نیچے کیئے بولی۔

''جی میں اُن کی دلہن......''

جواب کا سننا تھا کہ صدمے کی تلوار تیزی سے دل وجگر کو چیرتی ہوئی اُس کے وجود کی گہرائیوں میں اُترتی چلی گئی۔

............☆☆☆............

ٹوٹتی جُڑتی زندگی

جُدائی کے تین صبر آزما سال بعد آج اچانک چلتی بس کے جھروکے میں اُس بے مروّت کی ایک جھلک کیا دیکھی کہ دماغ کے پاتال میں دبی بھولی بسری یادوں نے یک بہ یک اُبھر کر دل کی بے چینی بڑھا دی۔ ماضی کے ہنستے کھیلتے ازدواجی لمحات کو یاد کر کے میٹھی کسک کا احساس ہوا۔

آہ...... کتنے خوشگوار مسرت بھرے دن تھے۔

اگلے ہی پل اُس کے پہلو میں بیٹھی چھوٹی نوجوان بہن، ہٹلر جیسی میری ضِدی سالی کو دیکھ کر سارے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ خون یہ سوچ کر کھول اُٹھا کہ اِسی کمبخت چڑیل نے ذراسی اَن بن کو ہوا دے کر گھریلو سکون کو آتش فشاں بنا ڈالا تھا۔ اپنی زہریلی چپڑ چپڑ باتوں سے ہمارے درمیان کانٹے بچھا کر فاصلے بڑھائے تھے...... ورنہ...... میری بے وفا صبا تو خدا ترس خاتون تھی...... پھول کی طرح کومل...... خوشگوار ہواؤں کی طرح معتدل ...... گائے کی طرح سیدھی سادھی، بے حد شریف...... ماتھے پر ناگواری کی شکنیں تو کبھی اُبھرتی ہی نہ تھیں۔

بس پیٹرول پمپ کی جرنیلی سڑک پر سے بھاگتی ہوئی اوجھل ہوئی تو میرے من میں سو فتنے برپا ہوئے۔ وجود پر سحر سا طاری ہو گیا، مانو کسی آفسوں گر نے جادوئی منتر پڑھ کر پھونک دیا ہو۔

میرا چھوٹا بیٹا جو پیٹرول پمپ پر رُکی ہوئی زائیلو کی پچھلی سیٹ پر ٹھیک میرے عقب میں بیٹھا تھا۔ بڑی معصومیت سے میرے کان کے قریب منہ لا کر دھیرے سے بُد بُدایا۔

’’ڈیڈی۔کوئی پہچان کی عورت تھی کیا......؟‘‘

’’نہیں تو۔‘‘میں نے جھوٹ کا سہارا لینا چاہا مگر اس کی معصوم نگاہیں حقیقت بھانپ چکی تھیں۔نو سال کی عمر کمسنی کے باوجود کافی سوجھ بوجھ کی ہوتی ہے۔وہ نٹ کھٹ مجھے چونکاتا ہوا پوچھ بیٹھا۔

’’کیوں ڈیڈ......وہ میری امّی نہیں تھی کیا۔؟‘‘

اُس کا سوال سُن کر مارے غصے کے میری بھوئیں تن گئیں۔لب تھرتھرا اُٹھے۔

’’ہاں......تھی شاید......تو کیا ارادے ہیں تمہارے۔‘‘

میرا لہجہ ذرا تیکھا تھا وہ ہڑابڑا گیا اور ہکلا کر بولا۔

’’کک......کچھ نہیں......یوں ہی پوچھ لیا۔‘‘

یہ بات میں اپنے تینوں بچوں کے پہلے ہی گوش گذار کر چُکا تھا کہ اُن کی امّاں کے لئے میری سوچ میرے جذبات میں نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔لٰہذا وہ......سوچ سمجھ کر ہم دونوں میں سے صرف کسی ایک کو چُننے......اور......ایک کو سدا کے لئے بھول جائے۔

بیٹے کے دل کی کیفیت کا اندازہ کر کے میرے دِل کی بیقراری بڑھنے لگی۔بس جا چُکی تھی ، نہ جانے کتنے کھٹے میٹھے خیالوں کے سلسلے برقی رووٗں کی طرح میرے دل و دماغ میں کھلبلی مچاتے رہ گئے۔

اِدھر امرناتھ یاتریوں کے اژدھام کی بدولت شہر سے باہر کے اِس فلنگ اسٹیشن پر بھی چھوٹی بڑی گاڑیوں کی قطاریں ڈیزل اور پیٹرول بھرنے کے لئے اپنی اپنی باری کے منتظر تھیں۔خدا خدا کر کے ہماری زائیلو کی باری آئی تو ٹینکی فل کرنے کے بعد ڈرائیور نے حساب کتاب چُکتا کر کے ٹیکسی جرنیلی سڑک پر اُتار دی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کے دوش پر اِس برق رفتاری سے بھگا دی کہ پیڑ، پودے، آبادیاں، لہلہاتے کھیت، جنگلات کے سلسلے تیزی سے پچھڑتے چلے گئے۔اِس بیچ اُس بے مُروّت کی بے وفائی یاد

کر کے میرا دِل داغ مفارفت کے مارے بُری طرح گلبلا تا رہا۔

ڈیڑھ دہائی پر محیط زندگی کا سنہرا ازدواجی دور جو ہم دونوں نے سہانے سپنوں کے تانے بانے بنتے ایک ساتھ گزارے تھے، نہ جانے کِس منحوس کی نظر بد کی بھینٹ چڑھی تھی کہ بسی بسائی گرہستی دو پارہ ہو کر رہ گئی۔ ایک ذرا سی بات کو ساس اور ضدی سالی نے ہوا دے کر ایسا تلاظم خیز طوفان بنا ڈالا تھا کہ پلک جھپکتے ہی عقل کی اندھی بہک گئی اور مجھے اپنے بطن نازک سے جنمے پھولوں جیسے کمسن بچوں کے سنگ منجدھار میں چھوڑ کر بے تحاشہ نکل بھاگی تھی کہ لاکھ آوازیں دینے پر بھی نہ پلٹی، جانے اُس کی ممتا اُس وقت کہاں مرکھپ گئی تھی۔ اپنے نو نہالوں پر بھی عار نہ آیا۔ یوں ہماری پُر بہار دُنیا پت جھڑ کی نذر ہو کے رہ گئی۔

میاں بیوی کی تکرار کس گھر میں نہیں ہوتی۔ امیر کی کوٹھی ہو یا غریب کی کھولی۔ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی بات پر ٹھن ہی جاتی ہے ہاں مگر جو بھی ہو، سب وقتی ہوتا ہے۔ بِن برسے بادل کی طرح ذرا سا گرج کر اپنے پیچھے پچھتاوا اور چوکسی چھوڑ جاتا ہے۔ البتہ، جہاں شیطانی اثر حاوی ہو جائے، وہاں گھر یا باہر کے سیانے مداخلت کر کے اپنی سوجھ بوجھ سے سنبھال ہی لیتے ہیں...... میرے ہاں تو...... بال کی کھال اُتارنے والے آستین کے سانپ بھرے پڑے تھے جو سمجھانے کی آڑ میں اُکسانے اور بہکانے کا گھناؤنا عمل کر کے بسا بسایا آشیانہ اُجاڑ بیٹھے...... قصور اصل میں میری بے وفا صبا کا تھا۔ نہ وہ نادان ذرا سی بات پر اُٹھ بھاگنے کی حماقت کرتی، نہ ہمیں اُلجھن بھرے یہ دن دیکھنے پڑتے۔

آج تین سال بعد اُس کی ایک جھلک نے بیتے شب و روز یاد دلا کر تن من میں نفرتوں کے شعلے بھڑکا دیئے۔ کتنی مشکل سے نونہالوں کو اُس کے بِنا حالات سے سمجھوتہ کرنا سکھایا تھا...... میں ان کا باپ تو تھا ہی، ماں بھی بن بیٹھا تھا۔ دفتری اوقات سے پہلے اور بعد میں چھوٹھا چوکا بھی سنبھالا تھا۔ کمائی کے ساتھ ساتھ کھان پان، دیکھ ریکھ کی ساری ذمہ داری اِس طرح نبھائی تھی کہ معصوموں کو کسی بات کی کمی نہ محسوس ہونے دی...... اُن کے پاس ہونے کی خوشیاں...... سیر و تفریح...... چھوٹی بڑی عیدیں...... من کو مار کر اُس سنگ دل کے بنا ہی

مناتے رہے۔

آج وہ کم ظرف بس کے جھروکے میں سجی سنوری دکھائی دی تو من کی شانتی پھر سے چرمرا کے رہ گئی۔ گھر سے اچھا خاصا موڈ لے کر چلا تھا، سارا کرکراہ ہو گیا۔ جی میں آیا کہ یہیں سے واپسی کر لوں، مگر نہیں۔ جانا ضروری تھا...... میرے دو بیٹے گرمیوں کی چھٹیاں گذارنے کے شوق میں پچھلے دس دنوں سے پہاڑی درے میں پھوپھی کے ہاں پڑے تھے۔ تعطیلات ختم ہونے کو تھیں۔ اُن کو لانا اور سب کو اسکول کے لئے یکجا کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

ٹیکسی کنگن بازار پہنچ کر حسب معمول سواریوں کے نان و نمک اور رفع احتیاج کے لئے ایک ٹی اسٹال کے سامنے جا رُکی۔ اور بھی کئی ٹیکسیاں ٹی اسٹال کے اغل بغل میں رُکی پڑی تھیں۔

شام کے لگ بھگ چار بج چکے تھے، ابھی روشن اُجالا تھا۔ اکثر گھاٹیوں میں چار بجتے ہی پہاڑوں کے سائے اُترنا شروع ہو جاتے ہیں۔

ڈرائیور اُتر کر چلا گیا، سواریاں تازہ دم ہونے کو نکل گئے۔ میں فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر اُترنے ہی کو تھا کہ ٹیکسی کا نوجوان ڈرائیور جو میرے قریبی دوست کا بڑا فرزند تھا فوراً ہی واپس آ کر مجھ سے ادب کے ساتھ مخاطب ہوا۔

''انکل جی، ہوٹل میں کافی رش لگا ہے۔ فرِش ہونے کی حاجت نہ ہو تو آپ دونوں کے لئے چائے وغیرہ یہیں منگوالوں۔؟''

''نہیں نہیں بیٹا، تم تکلیف نہ کرو۔'' میں نے منع کرتے ہوئے کہا۔ ''اُترنے کے بہانے ذرا سی چہل قدمی ہو گی تو ٹانگوں کی اینٹھن جاتی رہے گی۔ ابھی آگے کے لمبے سفر میں پھر سے تو ایک ہی جگہ بیٹھنا ہے۔ شکریہ، تمہارا اتنا کہنا ہی بہت ہے۔''

وہ چلا گیا تو چھوٹے بیٹے کو ٹیکسی سے اُترنے کا اشارہ کر کے خود بھی اُتر گیا۔ ابھی دروازہ بند کر کے دو قدم آگے گیا ہی تھا کہ میری نگاہ ٹی سٹال کے اندر چائے کی

چسکیاں لینے میں مشغول اُسی سنگدل پر جاٹھہری جو اپنی ضدی بہن کے ہمراہ ایک چوبی کُرسی پر سِمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ اُنہیں دیکھ کر میں ٹھٹھکا اور اُلٹے قدموں واپس ٹیکسی کے قریب لوٹ کر سوچنے لگا کہ شاید نوجوان ٹیکسی ڈرائیور نے اُن دونوں کی موجودگی کے خیال سے ہی میری حالت غیر ہونے سے بچانے کے لئے ٹیکسی میں چائے منگوانے کی پیش کش کی ہوگی۔ ویسے میرے ذاتی زندگی کی ناچاقیاں ڈرائیور کے باپ پر دوستانہ تعلقات کی وجہ سے پوری طرح عیاں تھیں۔

مجھے یکایک پلٹتا دیکھ کر میرے ساتھ چلتا ہوا بیٹا ٹھٹھک گیا اور ٹی اسٹال کے اندر جھانکنے کے فوراً بعد مجھ سے کہا۔

''آیئے ڈیڈ...... ہم چائے پینے کہیں اور چلتے ہیں۔''

''نا بیٹا...... اِس ٹی اسٹال کے سِوا اچھی چائے اور کہیں نہیں ملتی۔''

''لیکن ڈیڈ...... اندر تو ماں اور ڈین جیسی ماسی بیٹھی ہے۔''

''تو کیا ہوا...... تم آڈر دے کر چائے باہر لے آو۔ ہم یہیں پیئں گے۔''

''اور ڈیڈی...... اُن سے نگاہیں ملیں تو؟

''تو سلام کر لینا...... سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جاؤ جلدی کرو یہاں ٹیکسیاں زیادہ دیر نہیں رُکتیں۔''

''جی ڈیڈ......'' کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔ میں باہر ہی بے چینی کے عالم میں ٹہلتا رہا۔ تھوڑی دیر میں وہ چائے کے دو کپ لئے باہر چلا آیا اور مُسکرا کر میرے ہاتھ میں ایک تھماتا ہوا بولا۔

''دونوں مجھے گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ مجھے سلام کرنا پڑا۔

''ہُم م م م۔'' میں نے ہُمکارا بھر کر چُپ سادھ لی۔ وہ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے میری جانب کنکھیوں سے ایسے دیکھنے لگا کہ اضطرابی کیفیت چھپائے نہ چھپ سکی۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''اُن کی بس اِدھر تک ہی تھی۔''

''ہوگی......تو......''

''کہتی تھیں، آگے جانے کے لئے گاڑیاں نہیں مل رہیں۔''

بیٹے کے اندازِ تکلم میں ماں کے تیں ہمدردی کا اثر نمایاں تھا۔ خونی رشتے کی کشش سے شاید ننھے سے دل میں کھلبلی مچ رہی ہوگی۔ میں نے کنکھیوں سے نظر بھر دیکھ کر روکھے پن سے جواب دیا۔

''تم فکر نہ کرو۔ ایسے حالات کا وہ پہلے بھی سامنا کر چکی ہونگی۔ اُنہیں کون سا ہماری طرح پہاڑوں کے پار جانا ہے۔ اِدھر قریب ہی تو ہے گاؤں اُن کا......تم پریشان نہ ہو۔ وہ کوئی نہ کوئی صورت نکال لیں گی۔''

میں نے لاپرواہی سے کہہ کر کپ کو ہونٹوں سے لگالیا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر چپی توڑتا ہوا بولا۔

''ڈیڈ، ماسی ہماری ٹیکسی کے ڈرائیور سے خالی سیٹ کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔''

''ہُم م م۔ پوچھنے دو۔ بیک کی سیٹیں خالی پڑی ہیں۔ بٹھائے نہ بٹھائے اُس کی مرضی۔''

''ہاں ڈیڈ۔ سو تو ہے۔ مگر ڈرائیور نے آپ کا بہانہ بنا کر ٹال دیا۔''

''میرا بہانہ......؟......کیا بہانہ کیا......؟''

''ڈیڈ، ماسی نے اس کے ساتھ ایسے کھل کے بات کی جیسے پہلے سے جانتی ہو۔''

''وہ کسی زمانے میں پڑوسی رہ چکے ہیں۔ ڈرائیور کا باپ اُن کے محلے میں کرایہ پر رہتا تھا۔''

''تبھی تو ماسی بہت ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اس کے باوجود ڈرائیور نے آپ کا حوالہ دے کر بہانے سے ٹرخا دیا۔ کہہ دیا ٹیکسی آپ نے بُک کر رکھی ہے۔''

''میں نے بک کی ہے......؟ ......چلو یہ بھی اچھی کہی۔ اب تو کم از کم اور کہنے کی جرات نہ کرے گی۔''

''نہیں ڈیڈ......ماسی تو اُلٹا میرے پیچھے یہ کہتی ہوئی پڑ گئی کہ ڈیڈی مان جائے تو ڈرائیور کو اعتراض نہ ہوگا۔ مجھے آپ کو منوانے کے لئے کہہ رہی تھی۔''

اتنا کہہ کر وہ میرا ردِ عمل جانے بغیر دوسری جانب مُڑ گیا۔ غصّے کے مارے میری بھوئیں تن گئیں......میں نے اُس پر ترچھی نگاہ ڈالی۔ ہونٹ پھڑ پھڑا اُٹھے۔

''کیا سمجھتے ہو پُتر۔ تم منالوگے، اور میں مان جاؤں گا۔ بالکل نہیں۔۔ مجھے پریشان مت کر۔۔ یہ جان لے، اُس کے اور ہمارے راستے الگ ہو چکے ہیں۔ بس ایک پرچی پر لکھ کر دینے کی دیر ہے۔ ویسے بھی اب میں اُن سے کوئی واسطہ نہیں رکھنے والا۔۔''

میری برہمی پر وہ میری طرف گھوم گیا اور معصوم صورت بنائے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''انسانیت کے ناتے ڈیڈ......پلیز......بیچ رستے میں چھوڑ کے جانا ٹھیک نہیں۔ آخر وہ میری امّی ہے۔ پلیز ڈیڈی......کیا پتہ آج کے بعد۔۔۔اور کبھی ملے نہ ملے۔''

بیٹے کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ میرے دل کی گہرائیوں میں بھی درد کی ٹیسیں اُٹھیں۔ آن کی آن میں ماضی کی میٹھی یادوں نے شعور کو اِس احساس کے تحت جھنجوڑ کر رکھ دیا کہ کِس طرح میل جول کے اچھے دنوں میں ایسی ہی مسافرت کے دوران ایک دوسرے کا بڑھ چڑھ کر خیال رکھتے تھے۔ کیسے ایک دوسرے کی ضرورتیں پورا کرنے میں پیش پیش رہتے......ہائے وہ محبت واخلاص بھری خوشگوار قربتیں۔ اور اُف۔ آج کی یہ ناموافقت بھری دُوری۔ ایک دوسرے سے اجنبیوں کا سا رویہ......نہ سامنا کرنے کی صورت......نہ گفتگو کی ہمت۔ بس دونوں جانب برابر جھلسا دینے والی آگ......اور درمیان میں سالی نام

کے کباب کی ہڈی...... وہی جو بار بار گلے میں اٹکتی رہی...... جو نہ نگلتے بنی نہ اُگلتے بنی۔ میں نے بیٹے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''ارے تو میں نے ٹیکسی بُک تھوڑے ہی کر رکھی ہے جو اپنی مرضی کر لوں۔''

یوں کسی مصلحت کے تحت جواب دینے کے بعد چائے کا خالی کپ اُس کے ہاتھ میں پکڑوا دیا اور سفر کے لئے درجن بھر کیلے خریدنے قریب کے میوہ فروش کی دُکان پر چلا گیا۔

میرے لوٹنے تک ٹیکسی اگلے سفر کے لئے تیار ہو چکی تھی۔

میں اپنے فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھا...... تبھی...... عقب سے رسمی سلام کرنے کی دبی دبی، مترنم سی آوازیں لمحہ بھر کے لئے ترنگیں بکھیرتی ہوئی ٹیکسی کی آواز میں تحلیل ہو گئیں...... میں کوئی جواب نہ دے پایا، مُڑ کر عقب میں جھانکنے کی جرأت بھی نہ ہوئی......شاید وہ دونوں عقبی سیٹ پر جم چکی تھیں۔

ٹیکسی بڑے قصبے کے بازار سے نکلی اور نشیب و فراز سے گزرتی ٹیڑھی میڑھی جرنیلی سڑک پر آنے جانے والی نجی گاڑیوں اور فوجی کانوائے کے اغل بغل سے ہوتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک مختصر بازار والا چھوٹا سا قصبہ بھی پیچھے چھوٹ گیا۔

اب اگلا پڑاؤ میری بے وفا صبا کا مطلوبہ گاؤں تھا۔ اُن کے اُتر جانے کے بعد ہمارے راستے ایک بار پھر الگ ہونے تھے...... جوں جوں ٹیکسی اُن کے گاؤں سے قریب تر ہوتی گئی، احساسِ مفارقت نے دِل کی دھڑکنیں تیز کر دیں۔ بچھڑ کر جانے کا خیال کانٹے کی مانند چُبھنے لگا۔

اُف...... یہ کیسی مجبوری تھی، میں اُسے روک بھی نہ سکتا تھا۔ اُس کی ضِدی ہٹ دھرم بہن، جس نے ماضی میں صلح صفائی کے سارے حربے بیکار کر دیئے تھے۔ کسی چاق و چوبند

باڑی گارڈ کی طرح اُسکے سنگ چپکی تھی...... مجھے اس ظالم سے اسقدر چڑ ہو چکی تھی کہ، بس چلتا تو صفحہ ہستی سے مٹا دینے میں دیر نہ کرتا۔ مگر کیا کروں۔ بچوں کی ذمہ داریوں نے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ من کو مار کر جینا مقدر بن چُکا تھا۔

میں خیالوں میں گُم تھا کہ ٹیکسی رُک گئی۔ چونک کر نظر اُٹھا کے دیکھا، واقعی لہلہاتے کھیتوں کے درمیان اُن کا گاؤں بانہیں پسارے منتظر تھا۔ عقبی دروازہ کُھلنے کے ساتھ ہی رخصت طلب کرنے کی مدھم مگر مترنم سی آواز سماعت سے ٹکرائی۔ اب تو بچھڑ کر جانے کے احساس سے حالت اور بھی غیر ہو گئی۔ میں نے مُڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

عقبی دروازہ بند ہوا تو دردو غم کے مارے آنکھیں بھینچ لیں......

ٹیکسی میری حالت کی پرواہ کیئے بغیر اگلی منزلوں کی جانب بڑھ گئی۔ میرا دل جس قدر بوجھل تھا، اس لحاظ سے نہ جانے اماں سے دوبارہ بچھڑ جانے کے غم میں میرے بیٹے کا کیا حال ہوا ہوگا۔ یہ سوچ کر پیچھے مُڑے بغیر ہی اُس سے پوچھا۔

”کیوں بیٹا۔۔اب کچھ راحت ملی دل کو......؟“

وہ جواب دینے کے بجائے ٹھنڈی آہ بھر کے رہ گیا۔

اگلے ہی پل عقب سے ایک نسوانی رقعت آمیز آواز اُبھری۔

”نہیں ملی تو اُتر جاؤں کیا......؟ ......باپ بیٹا سوچ کر جواب دیں۔“

اس مانوس آواز نے میرے انگ انگ میں بجلیاں سی دوڑا دیں۔ میں چونک کر آواز کی طرف پلٹا تو اُس مغرور سنگدل کو ممتا اور احساس رفاقت کے جھلملاتے آنسوں اپنے بیٹے پر نچھاور کرتے دیکھ کر حیرت اور خوشی کے مارے مسخر ہو کے رہ گیا۔ حیا کی سُرخی سے صبا اختر کے رخسار بھی تمتما گئے۔

ہماری کھسیانی حالت پر سواریوں کے قہقہے چھوٹے اور میں شاد و ناشاد کے ترنگوں میں جانے کہاں کھو گیا۔

............☆☆☆............
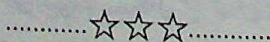
آبی ہیولا

بستی میں کھلبلی مچی تھی۔

کئی دنوں کے سلسلہ وار برسات سے جس بات کا اندیشہ تھا بالکل وہی ہوا تھا۔ جہلم اور معاون دریاؤں، ندی نالوں کے سرکش دھارے جگہ جگہ سے پُشتے پھاند کر بستیوں پر ہلّا بول چکے تھے۔ لگتا تھا ڈوبتی وادی ایک بار پھر برسوں پہلے کی ستی سر کا روپ دھار لے گی۔

طغیانی کا اژدھا نشیبی بستیوں کو زیر کرنے کے بعد ہولے ہولے رینگتا ہوا اُس بالائی عالیشان کوٹھی کی طرف سرکتا بڑھا، جس کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں لقوے کا مارا اظہر خان بے یار و مددگار چوبی بیڈ پر موت کی راہ میں آنکھیں سفید کئے نیم دراز پڑا تھا۔ اُس میں نہ اُٹھ بیٹھنے کی سکت تھی...... نہ صاف و شفاف الفاظ ادا کرنے کی طاقت...... لقوے کے اثر سے شریر کے دائیں حصے کی طرح چہرے کے آدھے جبڑے پر بھی بے حسی طاری تھی۔ تبھی تو اُس کے مُبہم الفاظ خال خال ہی سمجھ میں آتے تھے۔

اچانک گلی میں شور ہوا۔

پڑوس کے صحن کی دیوار گرنے کی صدا چھپاکے کے ساتھ گونجی اور فضاؤں میں بکھر کر تحلیل ہوگئی۔ اظہر خان ناتوانی کے باعث کچھ نہ سمجھا۔ وہ صرف دوسرے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیدے پھاڑ تارہ گیا جس کے اندر اُس کا اکلوتا بیٹا انجم نشے کی حالت میں بستی کے جھمیلوں سے بے خبر بدمست پڑا ہوا تھا۔ اِس خیال سے اس کے انگ انگ میں بجلی سی کوندی کہ فقط گز بھر کی نزدیکی ہونے کے باوجود انجم کو مدد کے لئے طلب کرنے کی اُس میں طاقت نہیں۔ اُس کی چھٹی حِس نیچے جانے والی سیڑھیوں کی جانب بھی اِس اُمید میں مُسلسل

متوجہ ہوتیں کہ شاید عاصیہ بیٹی یا گھریلو نوکر کی کوئی آہٹ سُنائی دے۔ شاید اُن میں سے کوئی مدد کو آن پہنچے، یا حالاتِ حاضرہ کی جانکاری دے کر من کی بے چینی دور کردے۔ مگر بدقسمتی سے وہاں مکمل سُناٹے کی کیفیت طاری رہی۔ حقیقت نہ جان پانے کی حسرت میں دِل کے نہاں خانے سے دُکھ بھری سرد آہ یہ سوچ کر بھری کہ جن چہیتیوں کی بقائے دوام کے لئے اپنی آخرت خراب کردی ہے وہی لاڈلے بے توجہی برت کر اُسے ایڑیاں رگڑتے مرنے کی حد کو پہنچا گئے ہیں۔

اظہر خان نے تڑپ کر مایوس نگاہیں کھڑکی سے باہر دوڑائیں۔ کافی فاصلے پر پیڑوں کے درمیاں نظر آنے والے مکانوں کی کھلی کھڑکیوں کے اندر افراتفری سی مچی محسوس کی۔ یہ منظر بستی میں رونما ہونے والی کسی بڑی اُفتاد کی طرف صاف اشارہ تھا۔

وہ ہڑبڑا کر زیرِ لب بڑبڑایا۔

''یا الٰہی۔ یہ کیا ماجرا ہے۔ کاش کوئی آ کے مجھے بھی بتا دے۔''

اُس نے ایک بار پھر انجم کے بند دروازے کی جانب پُرتجسس نگاہوں سے دیکھا۔ پھر نیچے جانے والی سیڑھیوں کی اور حسرت بھر نظر ڈالی...... جانے وہ دونوں کہاں چلے گئے تھے...... مہوش، اُس کی شریکِ رنج و راحت ہوتی تو کب کی دوڑی چلی آگئی ہوتی۔ وہ وفا شعار بھی تو وفا کا دم بھرتے بھرتے آخر دغا ہی دے گئی اور زندگی کی ڈگر پر بے سہارا چھوڑ کر سدا کے لئے راہِ عدم کو سدھاری تھی۔

دفعتاً نچلے دروازے پر کھٹکا ہوا۔

اُس نے سوچا۔

''شاید عاصیہ بیٹی چلی آئی ہوگی''۔

مگر وہاں عاصیہ نہیں، بوکھلایا ہوا گھریلو نوکر تھا۔ جو اپنی روزمرہ کی خدمت کے لئے حاضر ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر کافی راحت محسوس کی۔ اِس لئے کہ وہ اولادوں کی بہ نسبت کئی طرح

کی راز دارنہ ذمہ داری نبھانے کا مجاز تھا۔ گھر میں اولاد نام کے تین بچے تو تھے مگر نکمّے......
سراسر کھوٹے سکے......یعنی نافرمان۔

اُس کی آنکھیں اچانک اُن کی بے پروائی اور عدم توجہی کو یاد کر کے بھر آئیں۔ بڑا بیٹا کمال چالاکی سے روپے اینٹھ کر بیرون ملک جا چکا تھا۔ وہ باپ کی لاچاری اور نالہ وفریاد کی پرواہ کئے بغیر گوری میم پٹا کر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔

تین بچوں میں ایک پیاری بیٹی تھی عاصیہ۔ مگر......ماں کی وفات کے ساتھ ہی وہ بھی سر پھری ہو گئی تھی۔ بناؤ سنگھار اور میک اپ کی لت دِل سے لگا کر بے باک سہیلیوں کے ہمراہ فقط لٹر مستی کرتی پھرتی رہتی تھی۔

ایک چھوٹا نالائق بھی تھا۔ جِس کو ڈاکٹری پڑھوانے کا ارمان تھا...... بے حساب پاکٹ منی کے ملتے افیم گانجا کی بد مستی میں ریفرز گروپ، کے ہمراہ یارانہ گانٹھ کر وہ بھی اپنی دُنیا خراب کر بیٹھا تھا۔

کڑوی کسیلی باتیں یاد کر کے اُسے محسوس ہوا کہ اُسکی بچی کھچی دُنیا میں اب ہمیشہ کے لئے اندھیرا ہی اندھیرا چھایا رہے گا۔ یعنی ایسی دلدلی کھائی میں دھنسا رہے گا، جہاں سے بچ نکلنے کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔ لے دے کے یہی وفادار گھریلو نوکر گلہ تھا جو وقت پر آکر ازراہ انسانیت خطا ہوا بول و براز صاف کرتا اور دو نوالے ٹھونس کر رخصت ہو جایا کرتا تھا۔ اُس کے چلے جانے کے بعد اظہر خان کے ساتھ رہ جاتی، پل پل ڈسنے والی ناتوانی بھری تنہائی۔ یا پھر......آخری ہچکی لینے کی حسرت بھری آس۔

یکا یک اُس کی توجہ نوکر کی بوکھلاہٹ پر مرکوز ہوئی۔ یقین تھا اُسے حالات کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانکاری ضرور ہوگی۔ نوکر باتھ روم میں سے روز کی طرح پانی کی چھوٹی بالٹین بھر لایا اور آتے ہی اُس کے پہلو سے بڑی تیزی کے ساتھ لحاف ایک طرف سرکا کر بلا توقف نچلا دھڑ صاف کرتے ہوئے بولا۔

”صاحب سیلاب کا پانی چاروں طرف بھر چکا ہے......گلی کوچے، آنگن ہر جگہ گھٹنوں گھٹنوں پانی ہے۔ کہیں کہیں سڑکیں بھی زیر آب آچکی ہیں۔ مکانوں کا تو اور بھی برا حال ہے۔ نچلے کمروں میں پانی بھر چکا ہے......سنا ہے پیر پنچال کے پہاڑوں میں ایک ساتھ بے شمار بادل پھٹ پڑے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس بار اتنی زور کا سیلابی ریلہ آیا ہے......لگتا ہے پانی کی سطح اور بڑھے گی۔ بستی کے لوگ زیادہ تر محفوظ ٹھکانوں کو جاچکے ہیں۔ سارا محلّہ لگ بھگ خالی ہو چکا ہے......ویسے آپ فکر نہ کریں۔ پانی بڑھا تو نچلی منزلوں کو ہی چھو کر نکل جائے گا۔ عاصیہ بیٹی ماسی کے ہاں بیٹھی ہے۔ مجھ سے آپ کا خیال رکھنے اور کسی طرح نکال لانے کی تاکید کر رہی تھی۔ لیکن ایسے حالات میں ایک اکیلا کیا کر سکتا ہوں۔ عاصیہ بیٹی نے ڈبہ بند ٹفن اور منرل واٹر کی کچھ بوتلیں دے کر آپ تک پہچانے کی تاکید کی تھی۔ سو میں کسی طرح لے آیا......آپ کی صفائی کا بھی خیال تھا......چھوٹے انجم بابا کو اِدھر اُدھر بہت تلاش کیا......کہیں نہ ملا۔ یہاں آکر اس کے کمرے میں جھانکا تو اندر بیڈ پر مست پڑا ہوا پایا......شاید کچھ چڑھا بیٹھا ہے۔ میں نے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ سیلاب کے بارے میں بتایا بھی، مگر اُسکے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اُلٹا مجھے ہی لتاڑ دیا۔

تازہ حالات کی جانکاری دیتے دیتے بول براز صاف ہو گئے تو نوکر نے باتھ روم میں جا کر ہاتھ مُنہ صابن سے مل کر دھو لیئے، پھر تیزی سے بیڈ کے قریب آکر ٹفن سے پکا کھلا کھانا بڑے بوّل نُما کٹورے میں پروس کر چمچ سے ٹھونستے ہوئے کِھلا تا رہا...... جی بھر کر کِھلانے کے بعد پانی کے چند گھونٹ پلا دیئے اور ٹفن کے برتن سمیٹ کر رخصت چاہی۔

”اچھا صاحب۔ چلتا ہوں۔ بیوی بچوں نے ایک سرکاری اِسکول میں پناہ لے رکھی ہے، انہیں سنبھالنے کے بعد، خدا نے چاہا تو پھر آنے کی کوشش کروں گا۔ اچھا صاحب۔ خدا حافظ۔“

اتنا کہہ کر وہ جتنی تیزی سے آیا تھا اِتنی ہی تیزی سے لوٹ گیا۔

موسلا دھار برسات سے ماحول اُداس اُداس تو تھا ہی، سیلاب کے بارے میں سُن

کر اُس کی حالت اور بھی غیر ہوگئی......اُسے یاد آیا۔

سِٹی پلاننگ آفیسر کی حیثیت سے ترقی پاتے ہی کئی چاپلوس ماتحت ملازموں نے اِسی وی آئی پی علاقے کو بود و باش کے لئے محفوظ اور موزوں قرار دے کر اُسے زمین خرید نے کے لئے اُکسایا تھا، اور اُس نے اپنے دھڑلے پن کی وجہ سے رشوتیں تحفہ جات اور نذرانے دو دو ہاتھوں بٹور کر یہاں کی مہنگی زمین خریدی تھی اور پورے شدومد کے ساتھ یہ عالیشان کوٹھی تعمیر کروائی تھی۔ مگر ہائے ری قسمت، یہ جگہ بھی طغیانی کی زد سے بچ نہ پائی......اُسے احساس ہوا کہ ساری بربادیوں کی وجہ صرف اِس کی اپنی بدنیتی اور بُرے کرم ہیں۔ سچ مچ کِسی کے اچھے بُرے محرکات ہی نہ صرف اپنے لئے......دوسروں کے لئے بھی وبال یا جلال کا سبب بنتے ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ آفیسرانہ ملازمت کے دنوں اُسے بے میل حرکتوں سے باز رکھنے یا روکنے ٹوکنے کی کِسی میں جُرات نہ ہوتی تھی، ماسوائے نیک صفت، جوان اور خوب صورت بیوی مہوش کے، جو بار بار اُسے شیطانی مایا جال سے بچ رہنے کی دہائی دیتی رہتی تھی۔ ٹوک ٹوک کر غضب الٰہی سے آگاہ کرتی ہوئی کچھ نہ کچھ سمجھاتی رہتی اور وہ ہر بار ہنسی مذاق میں ٹال جاتا تھا......ایک دن تنگ آکر آخری آزمائش کے طور پر وہ پوری طرح اُلجھ پڑی۔

''آپ توجہ کیوں نہیں دیتے جی......جان بوجھ کر مکروہات میں پڑنا ٹھیک نہیں۔ یہ اوپر کی کمائی بچوں کے خون میں سرائیت کر گئی تو سنبھالے نہ سنبھلیں گے۔ یہ بگڑ گئے تو بھرا پُرا گھر نحوست اور اشانتی کا گڑھ بن جائے گا۔ نیاز نمازیں سب اکارت جائیں گئیں۔ اور جو تم کِسی کا حق مار کر وہ قالین والا جائے نماز لائے ہو نا۔ وہ بھلے ہی قیمتی ہو۔ خوبصورت ہو۔ اِس پر پڑھی جانے والی نمازوں کا ثواب، آپ کو نہیں، اُسی مظلوم کو ملتا رہے گا......آپ کو ملے گا تو فقط بے سکونی اور پریشانی......خدارا دنیا کی طمع سے زیادہ عاقبت کی فکر کیجئے......کہیں یہ لالچ کِسی دن اژدھا بن کر گھر کے گھر کو نہ نگل لے۔''

اظہر خان مُسکرا کر اس کی التجائیں ان سُنی کرتا رہا، اور پھر لا پروائی سے بولا تھا۔

’’ مجھے بھی رشوتیں لینے کا کوئی شوق نہیں جانِ من، بس بچوں کی اعلیٰ تعلیم، بیٹی کی اونچے گھرانے میں شادی اور اپنے لئے ایک عالیشان کوٹھی کی تمنا ہے۔ ٹھاٹھ باٹھ ہوگی تو اپنے پرائے سبھی سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ آگے پیچھے دم ہلاتے پھریں گے۔ یہ سب ہو جائے تو سب چھوڑ دوں گا۔‘‘

وہ بدک کر تلخ لہجے میں بولی تھی۔

’’ اور جو...... ان سب کو پانے کے لالچ میں جنّت ہاتھ سے چھوٹے...... وہ......؟ توبہ توبہ۔ خدا کے لئے باز آئیے اظہر۔ ورنہ سچ کہتی ہوں۔ میں آپ کے ہاتھ کا ایک ایک دانہ تب تک خود پر حرام کر لوں گی جب تک کہ آپ توبہ نہیں کر لیتے، اور مجھے حلال کی کمائی کا یقین نہیں ہو جاتا۔‘‘

مہوش کی ہٹ دھری پر وہ جل بُھن کر رہ گیا اور ایک نگاہ غضب ڈال کر بولا تھا۔

’’ احمقانہ کلام مت کرنا سمجھ۔ آج کے زمانے میں ہاتھ آئی لکشمی ٹھکرایا نہیں کرتے۔ میری مانو ہمیشہ ٹھاٹھ سے رہو گی۔‘‘

اتنا کہہ کر وہ لا پروائی سے جانے لگا تو مہوش برہم ہو کر فیصلہ کُن لہجے میں بولی تھی۔

’’ سُنئے جی۔ نہیں چاہیئے مجھے رشوتوں کی دولت سے بنی ٹھاٹھ باٹھ...... بس دو وقت حلال کی روٹی ملتی رہے یہی بہت ہے۔ مجھے تو نفاست بھرا روح افزا گھر چاہیے۔ جس میں سُکھ، سکون میسر ہو۔ اولاد فرمانبردار اور صوم وصلوات کے پابند ہوں۔ فرشتے اُتر کر خوشیوں کی بشارتیں دیا کریں۔ مجھے مایوس مت کیجئے اظہر خان۔ آپ نہ مانے تو میں سچ مُچ بھوکی رہ لوں گی، پھر چاہے میری جان ہی چلی جائیے۔‘‘

اُس دن وہ تلملاتا بڑبڑاتا ہوا اُچاٹ سی نگاہیں ڈال کر کھِسک گیا تھا۔ اُس کے وہم

وگماں میں بھی نہ تھا کہ وفا شعار مہوش سچ مُچ احتجاجاً فاقہ کشی کر کے خود کو ہلاکت میں ڈالنے کی حماقت کر بیٹھے گی اور وہ واقعی رزق حرام سے بچ رہنے کی کوشش میں اپنے وعدے پر ڈٹی رہی۔ پھر کئی روز تک بھوک سے نڈھال رہنے کے بعد خالق حقیقی سے جاملی۔

وہ آخرت کو سدھاری تو اظہر خان کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ زندگی بے پتوار ہو کے رہ گئی۔ یہی وہ صدمہ عظیم تھا،جس نے اُسے بلڈ پریشر کی بھینٹ چڑھا دیا اور فالج میں جکڑ کر بستر مرگ سے چپکا دیا۔

بیتی خطاؤں کو یاد کر کے اُس نے جُھر جُھری سی لی۔

مگر مِثل۔ 'اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیا چُگ گئی کھیت'......بیش قیمتی وقت تو بند مٹھی کی انگلیوں سے کِھسکتے ریت کی طرح کب کا نکل چُکا تھا۔

اِدھر وہ پریشان......

اُدھر طغیانی کے بڑھتے ریلے......سطح آب کی اُپھان مُسلسل بنائے ہوئے۔

علاقے کے لوگ بچ بچا کر نکلتے چلے گئے......ایک بے بس اظہر خان تھا،جس کی خبر لینے کوئی نہ آیا......

اچانک گڑگڑاہٹ کی آواز سے کوٹھی دہل اُٹھی۔ چوکنا ہو کر کھڑکی سے نظر آنے والی منظر کی اور دیکھا۔ دُور پیڑوں اور مکانوں کے درمیان اُٹھتے گرد و غبار کے بیچ ایک مکان غائب ہو چُکا تھا۔ شاید طغیانی کی تاب نہ لا کر ڈھہ گیا ہوگا۔ خوف کے مارے سارے شریر میں سنسنی دوڑ گئی۔ دل یہ سوچ کر دہل اُٹھا کہ نہ جانے اور بھی کتنے مکانات بنیادوں میں کمزور پڑ کر ڈھنے والے ہوں گے۔ اور اگر...... یہ کوٹھی بھی اسی طرح ڈھ......تو......!......اس سے آگے وہ سوچ نہ سکا۔

پانی کی بتدریج بڑھتی سطحِ آب نے دوسری منزل میں مداخلت کی۔ تو وہ اور بھی پریشان ہوگیا۔ گھبراہٹ کے مارے حلق سے عجیب طرح کی سسکاریاں نکالیں...... پانی دروازے سے کلکل کرتا سانپ کی طرح لہراتا بل کھاتا اندر ہی اندر پھیلتا چلا آیا۔ رفتہ رفتہ کمرے کا فرش تالاب نما بنا۔ آن کی آن میں پانی منزل کے دوسرے کمروں میں بھی راستہ بناتا ہوا جا گھسا۔

تبھی دوسرے کمرے سے چونکا ہوا انجم ہراساں و پریشاں دیوانہ وار ہڑ بڑاتا ہوا نکلا۔ سیلاب کی ناگہانی صورت حال نے اُس کا نشہ ہرن کر دیا تھا۔ گھبرائی نگاہیں بے بس و لاچار باپ پر پڑتے ہی تشویش کے مارے پھیل گئیں۔ منہ کُھلے کا کُھلا رہ گیا۔ پھر احساس خطا اور عدم توجہی سے پشیمان ہوکر تیزی سے اُس کے چوبی بیڈ کے قریب آیا اور بے حد فرمانبردارانہ لہجے میں بولا۔

''ابّا...... اتنا پانی چڑھ آیا...... آپ نے مجھے خبر نہ کی۔''

''پُتر......''

بے اختیار اظہر خان کے بے حس جبڑے پھڑ پھڑائے...... کمزور اور پلپلے ہونٹوں سے طنز بھرے غیر مبہم جملوں کی جھڑی لگ گئی۔

''خبر تو...... ہوش والوں...... کو...... دی جاتی ہے...... میرے لئے...... تمہارا ہونا...... نہ ہونا...... ایک سی بات ہے...... اور پھر...... میں بھی...... کون سا...... صحیح وسالم...... جی رہا...... ہوں۔ نیم مردہ...... جسم میں...... آدھی جان...... باقی ہے...... مجھے...... موت جس صورت...... میں بھی...... ملے...... قبول...... ہے...... لیکن...... پُتر...... تم تو...... کسی طرح...... بچا لو...... خود کو...... تجھے...... ابھی...... بہت...... جینا ہے...... اپنی...... دیدی کا بھی...... تو...... خیال...... رکھنا...... ہوگا۔''

اظہر خان نے کھینچ کھینچ کر اپنی بات بہ مشکل تمام کر دی۔ انجم تڑپ کر بولا۔

''مجھے معاف کر دیجئے ابا جان۔ اب میں آئیندہ کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا......ٹھہریئے...... پہلے میں آپ کو یہاں سے نکالنے کے لئے کچھ کرتا ہوں۔''

''نانا...... بیٹا...... بہت مشکل ہے......تم ...... یہاں سے ...... نکل سکو......تو فوراً......نکل لو......ویسے بھی......تم سب ...... پہلے ہی ...... مجھ سے ......دُور ......جا چُکے ......ہو''۔

''نہیں ابا...... پہلے جو ہوا، سو ہوا، ......اب آگے ایسا نہیں ہوگا۔ سچ پوچھئے تو میں نے اِن واہیات سے پہلے بھی چھٹکارا پانے کی کوشش کی تھی۔ تب مجھ میں self confidance نہیں تھی۔ مگر اب دوبارہ میڈیکل سینٹر جا کر اپنا علاج کرواؤں گا اور اِس لت سے چھٹکارا پا کر ہمیشہ کے لئے آپ کی خدمت میں جُٹ جاؤں گا۔ اب میری وجہ سے آپ کی دل آزاری کبھی نہ ہوگی۔ بس اِس بار معاف کر دیجئے۔''

اظہر خان بیٹے کی پشیمانی پر حیرت میں نہ ڈوبے۔ اصل میں وہ ہر طرح کی گہری چوٹ پہلے ہی کھائے ہوئے تھے۔ البتہ اِس باریوں توبہ کرنے پر مطمئن ضرور ہوئے۔

ابا کو چپ ہوتے دیکھ کر انجم نے منّت سماجت کرنے کے انداز میں اُس کی ٹھڈّی پکڑی۔

''پلیز۔معاف کر دیجئے ابا جان۔''

دوسرے ہی پل اُس کی نگاہ جیسے ہی کھڑکی کی جانب اُٹھی، باہر کی آبی سطح کو پورے شباب پر لہریں مارتا دیکھ کر سٹی پٹی گم ہوگئی۔ حواس باختگی کے عالم میں قدم خود بخود کھڑکی تک چلے گئے۔ ہونٹوں میں لرزش ہوئی۔

''باب رے باب کتنا پانی چڑھ آیا ہے۔ ساری بستی جھیل بنی ہے۔ یا خدا، اب کیا ہوگا۔''

''پریشانی کے عالم میں اُس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھاما...... اُلجھے ہوئے بال

انگلیوں میں جکڑ لیں۔ کچھ دوری پر بستی کے بہت سارے گھریلو سامان پانی کی سطح پر اِدھر اُدھر ڈول رہے تھے۔ اُن میں پلاسٹک کے ایک بڑے سے پیپے کو تیرتا دیکھ کر اُس کے من میں بچ نکلنے کی ایک ترکیب سوجھی۔ وہ کوئی پل ضایع کیئے بغیر باپ کی اور مُڑا، اور بالائی منزل کی طرف جاتے جاتے کہتا گیا۔

''میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں ابا جان۔ آپ فکر نہ کریں۔''

بالا خانے میں پہنچ کر دائیں بائیں بکھرے پڑے کاٹھ کباڑ کو تیزی سے ٹٹولنے لگا...... ہر گھر کے بالا خانے میں اکثر گھر میں استعمال کرنے کے بعد رد کیئے گئے پرانے سامانوں کا ڈھیر پڑا رہتا ہے۔ اُسے ایسے ہی ڈھیر میں سے چوبی تختے، اور پچاسوں دھارا تیل کے بڑے پلاسٹک پیپے پڑے ہوئے ملے۔ ان میں سے بیشتر پیپوں کو یکجا کر کے ایک رسی میں پرو کر اس طرح جوڑا کہ پانی پر ٹھہرنے والا نمونہ سا تیار ہو گیا۔ پھر انہیں گھسیٹتا ہوا ابا کے کمرے میں اُتار کر کھڑکی کے راستے پانی پر ڈال دیا۔ چند چوبی تختے اِن پر بیٹھا دینے سے کِسی قدر گذارے کی عارضی کشتی تیار ہو گئی۔

اب انجم نے ابا کی طرف اشارہ کیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مُسکرا کر رہ گیا۔ شاید ٹالنا ہی صحیح تھا، اس لئے کہ ناتوانی میں عارضی کشتی دونوں کے لیے خطرے کا سبب بن سکتی تھی۔

انجم باپ کا مفہوم سمجھ کر یقین دلاتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے ابا جان۔ میں جا کر آپ کو نکلوانے کا کوئی نہ کوئی بندوبست کرتا ہوں۔ زندگی رہی تو کامیابی ضرور ملے گی۔ اچھا۔ خدا حافظ۔''

اُس کے جاتے ہی کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ بیٹے کی سعی لاحاصل پر باپ کی محبت نہ صرف مچل اُٹھی بلکہ انداز دل جوئی پر یک گونہ تسکین بھی محسوس کی۔ بیرونی کھڑکی پر جہاں سے وہ گیا تھا کچھ دیر تک پانی کے زوردار چھپاکے پڑتے رہے۔ رفتہ رفتہ ٹھہراؤ سا آ گیا۔ اب صرف مدھم مدھم ہلکورے تھے۔ روح فرسا جدوجہد میں بیٹے کی قیمتی زندگی داؤ پر

لگی دیکھ کر اظہر خان کی تشویش بڑھ گئی تھی۔

انجم جا چکا تو اُسے یہ سوچ کر خود سے گھِن آنے لگی کہ بچوں کی گمراہی، گھر بھر کا زوال اور بستی کی بربادی کا اصل ذمہ دار، اصل مجرم وہ خود ہے۔ شہری وکاس کے نام پر بے شمار ناقص منصوبے جو اکثر اوقات ناجائز کمائی کے لالچ میں اُس کی میز پر سے مضبوط سفارش کے ساتھ گذرے تھے۔ اُن میں سے ایک، طغیانی کی صورت میں نہ صرف شہر و دیہات میں غضب ڈھا رہا تھا بلکہ خود اُس کے کمرے میں گھُس کر اُسے للکارتا ہوا وہ سارے نازیبا اعمال یاد دلا رہا تھا۔ جن کے سرزد ہونے سے یہ ساری مخدوش صورتحال پیدا ہوگئی تھی۔ اُن سارے مجرمانہ خطاؤں کو یاد کر کے اب اُسے خود بھی سچ مُچ موت کی تمنا ہوئی......

مگر موت...... پانی کی شکل میں بیڈ کی اوپری سطح کے قریب رُک کر جیسے اُس کا منہ چڑھا رہی تھی اور جیسے غضبناک اِچھا داری ناگن کی طرح آبی ہیولے کی شکل میں اُٹھ اُٹھ کر پھُنکارتی ہوئی اُس کی سہمی آنکھوں میں اپنی دہکتی آنکھیں ڈال کر کہہ رہی تھی۔

''سزا کے لئے تیار ہو جا اظہر خان ۔۔۔ یا پھر ذرا بھی حیا باقی ہے تو خود آ کر سما جا مجھ میں۔ میں تجھے سارے بندھنوں سے آزاد کرنے آئی ہوں...... چل آ...... تجھے تیری صحیح منزل دکھادوں۔''

تصوراتی آبی ہیولے کی سرزنش پر اُس نے موت کی آرزو میں ذرا سا کسمسانے کی کوشش کی۔

ابھی زور لگا کر ہل ہی پایا تھا کہ ایک انجانی قوت کا جھٹکا لگا۔ اِدھر وہ دھڑام سے پانی میں گر کر چھٹپٹانے لگا...... اُدھر۔ اندیشوں کا مارا انجم پوری تگ و دو کے بعد اپنے گھریلو نوکر اور دیدی عاصیہ کے ہمراہ ایک بے چھت کی ناؤ لے کر کوٹھی کی کھڑکی سے آ لگا۔

............☆☆☆............

مِیاں فَصیح

دوسرے محکمے سے ٹرانسفر ہوکر آئے آفیسر نے نئے ماتحت کلرکوں کو اپنے دفتر میں یکجا کر کے کہا۔

''میں جانتا ہوں، آج کل مختلف دفتروں میں دھاندلیاں کافی عروج پر ہیں۔ کام میں لیت ولعل، ٹال مٹول اور آج کل کرنا ایک مرض بن گیا ہے۔ رشوتیں بٹورے بناء سائیلوں کا کام نہیں نپٹایا جاتا۔ فرض شناسی برائے نام رہ گئی ہے...... میں نہیں چاہتا، میرے دفتر میں بھی اس قسم کی شکایت دیکھنے سُننے کو ملے۔ اِس لئے آج سے تعطل میں پڑی ساری فائیلس بناء دیری کئے نپٹائے جائیں...... عدم تعمیل کی صورت میں قصوروار کی نوکری خطرے میں پڑسکتی ہے۔ معطل ہونے کی بات الگ...... برخاست تک کی نوبت آسکتی ہے۔''

سارے ملازم ہمہ تن گوش سُن کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

کچھ دیر بعد ھیڈ کلرک فائیلوں کا ایک بنڈل لئے حاضر ہوکر ادب سے بولا۔

''جناب یہ ٹھیکیداروں کی پینڈنگ فائیلس ہیں جو کِسی وجہ سے کلیئر نہیں ہو پائیں۔''

''یہاں رکھ دو۔ میں دیکھتا ہوں۔''

ھیڈ کلرک فائیلوں کو ٹیبل پر رکھ کر کمرے سے نکل گیا۔

اگلے دن ایک خوش پوش شخص مٹھائیوں کا چوکور ڈبہ لئے آفیسر سے اجازت لے کر اندر داخل ہوا اور ڈبے کا ڈھکن کھول کر اُس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

''سر مُنہ میٹھا کیجیے۔''

''یہ کِس خوشی میں......؟''

جی میں ایک مقامی ٹھیکیدار ہوں۔ کافی مُدّت سے میری فائیل رُکی پڑی تھی، آج آپ کے ٹیبل پر آ گئی تو اُمید کی کرن بندھ گئی۔''

آفیسر نے بُرا سا مُنہ بنایا ہی تھا کہ اُس کی نگاہ برفیوں کے نیچے دبی نوٹوں کی گڈی پر پڑی۔ تمتماتے ہوئے نگاہوں سے اُس کی جانب غور سے دیکھا۔ وہ مُسکرا کر بولا۔

''جی پہچانا نہیں۔ میں آپ کا پُرانا سائیل......''

آفیسر نے فوراً بات کاٹ دی۔ اُس کے ماتھے پر پسینے کی ننھی بوندیں پھوٹ پڑی تھیں۔

''ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ کون سی ہے آپ کی فائیل......''

ٹھیکے دار نے جھٹ پٹ بنڈل میں سے اپنی فائیل الگ کر کے سامنے رکھدی۔

''ٹھیک ہے۔ میں دیکھ لوں گا۔ آپ جا سکتے ہیں۔''

اُس کے جاتے ہی مٹھائی کا ڈبہ مُنہ چڑھاتے ہوئے ٹیبل کی دراز میں چلا گیا۔

............☆☆☆............

جینے کی آس

مُسلسل ہڑتالوں اور غیر معینہ کرفیو کی وجہ سے رمضان جو کی زندگی اجیرن بن چکی تھی۔ بیکاری کی تپش سے جلی نیند کے باعث وہ حسب معمول دیوار سے ٹیک لگائے فکر معاش میں حُقے کے کش پہ کش لیتا تدبیروں کے جوڑ توڑ میں اُلجھ کر سوچ رہا تھا کہ پریوار پر منڈلاتے فاقہ کشی کی نحوست کا تدارک کیسے کیا جائے۔ کیسے کمسِن جگر گوشوں کی چپاتیوں جیسے چپکے بھوکے شکموں کی کم خوری دور کرنے کی راہ نکالے۔

اُدھر دور کہیں رات کی تاریکی میں احتجاجیوں کا غل غپاڑ بدستور بلند تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ انتشار کا یہ سِلسلہ کئی روز تک تھمنے والا نہیں۔

رمضان جُو کی خوبصورت شریک حیات زونہ بھی بستر پر حالت اضطراب میں نیم دراز...... آدھی آدھی پیٹ دُبکے بچوں کو حِصار میں لئے ...... حصولِ خور دونوش کی اُدھیڑ بُن میں مُبتلا ہو کر مُرجھائی جا رہی تھی۔

بچے تین تھے۔ ایک پہلو سے چپکی تین سالہ چھوٹی حاجرہ ...... دوسری حاجرہ کے بغل میں لیٹی اُس سے چار سال بڑی نرِگس ...... اور تیسرا رمضان جو کے بغل میں لیٹا دونوں بچیوں سے بڑا دس سالہ طارق ...... سبھی بے چینی کے مارے نیم خوابی کی حالت میں بکھرے پڑے تھے۔

رمضان جُو بھلے ہی ایک ہُنر مند مکان مستری تھا، مگر تھا تو اُجرتی مزدور ہی ...... اور پھر ...... مزدوری لنڈوری ہوتی ہے ...... اچھے حالات میں بھی کبھی ملی ...... کبھی نا ملی ...... یہاں تو فتنہ انگیز حالات ہی ایسے تھے کہ جس کے تسلسل نے اوروں کی طرح اُس کے بھی گھر کا

سُکھ چین درہم برہم کر ڈالا تھا...... کسب معاش پر کاری ضرب لگا کر بُرے وقتوں کے لئے نفس مار مار کر بچائی ہوئی جمع پونجی کی تھیلی میں ایسی چھید کردی تھی کہ بچے کھچے روکڑوں کے صرف ہوتے ہی اناج دالوں کا ذخیرہ ختم ہوتے ہوتے کنستروں کے پیندوں سے جالگا تھا۔ شکم سیر ہونا ایسا دوبھر ہوگیا کہ مرغن غذاؤں کے عادی بچوں کو اُبکائی لانے والی کھچڑی کا مزہ چکھنا پڑا۔ چائے کی جگہ گُڑ کے شیرے نے لے کر مُنہ کا مزہ اور بھی کِر کِرا کر ڈالا......

تینوں بچے زور و جبر پر ندی ندی آنسوں بہائے......

ہر لقمے پر ہچکچائے......

ہر گھونٹ پر روتے بلکتے رہے......

مگر کیا کرتے، زہر مار کئے بنا رہ بھی نہ سکے۔

کہتے ہیں تہی دستی میں پرائے تو پرائے اپنے بھی بیگانوں کی طرح مُنہ موڑنے سے نہیں کتراتے۔ وہ بھی اِس تلخ تجربے سے دوچار ہوا، اور رشتے ناتوں کے در سے خالی کشکول میں نامرادی کے آنسوں لئے لوٹ آیا۔ اڑوس پڑوس کے اُدھار دینے والے دکاندار تو مسلسل اُدھاری کے چلتے پہلے ہی دیوالیہ ہوچکے تھے، اس لئے کہیں سے بھی مدد کی اُمید نہ بندھی۔ گھر میں تانبے کے چند برتن تھے، ایک ایک کر کے اونے پونے دام بیچ دیئے...... کچھ مُدت بسر اوقات ہوتی رہی...... مگر شومئی قسمت...... شورش کی طوالت شیطان کی آنت کی طرح ایسی بڑھتی گئی کہ سارا کسب معاش چوپٹ ہو کے رہ گیا۔ اب گھر میں بیچ کر گذر بسر کرنے لایق کوئی چیز بچی ہی نہ تھی۔ بٹوارہ خانگی میں مکان کے ساتھ ساتھ سونے چاندی کے زیورات برتن بھانڈے سب پہلے ہی بندر بانٹ ہوچکے تھے۔ جس میں اُسکے حصے کے زیورات پیٹ کی آگ بُجھانے کے کام آگئے تھے...... البتہ...... جنتی امّاں نے زونہ کی نازک اُنگلی میں سگائی کے دِن اپنے ہاتھوں سے سونے کی جو انگوٹھی پہنائی تھی وہ اب بھی بدستور دُمک رہی تھی...... مگر اِن حالات میں اِس پر نظر ڈالنا بدشگونی ہی کہلاتی۔

رمضان جوُ انگوٹھی کے ارادے کو مُسترد کر کے حُقہ گُڑگُڑاتا ہوا کوئی اور پہلو کھوجنے ہی لگا تھا کہ اُس کا دایاں ہاتھ تیزی کے ساتھ حُقے کے منقش گُل بوٹوں پر پھسلنے لگا، ایسے جیسے کِسی نایاب ہیرے کو پرکھنے لگا ہو۔

''واہ...... کتنی خوبصورت گُلکاری ہے......''

وہ خوشی کے مارے بے ساختہ بڑبڑایا۔

''اِس کے تو اچھے پیسے مل سکتے ہیں...... یہ خیال بھلا پہلے کیوں نہ آیا۔ کم سے کم بچوں پر فاقوں کی نوبت تو نہ آتی۔''

اُسے یاد آیا، بٹوارا خانگی کے بعد بوڑھے والدین نے بڑے بیٹوں کے ساتھ جانے کی بجائے زندگی کے بچے کُھچے ایام خود اُس کے ساتھ گذارنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ یوں وقتِ آخر تا بنے کا یہ منقش حُقہ بٹنے کے بجائے اُس کی ملکیت میں آ گیا تھا...... خوشی کے مارے رمضان جوُ کا ہاتھ بے تحاشہ حُقے کے نقشین چلم سے پینیدے تک اور گھٹے سے کلکی کے سرے تک مچلتا چلا گیا...... ایک پل کے لئے سارے شریر میں سکون کی لہر سی دوڑی۔ کچھ دیر یہ خوش فہمی قائیم رہی مگر پھر یہ خیال ذہن میں اُبھرا کہ بھلے ہی میں ایک مکان مستری ہوں، پر جب جب اپنے غریب خانے کے دریچے پر گاؤ تکیہ کے ساتھ شان بے نیازی سے ٹیک لگائے اس دلکش ذرنگار حُقے کی لمبی لچکیلی نلی سے لمبے لمبے کش لیکر ہوا میں چھوڑتا ہوں، تب مجھے اپنا لاغر وجود کسی والیٔ ملک سے کم نہیں محسوس ہوتا۔ تب دل کو بڑی ٹھنڈک ملتی ہے...... ضرور پُرانے وقتوں میں میرے اسلاف میں سے کوئی حاکموں یا اُمراء میں صاحبِ حیثیت رہا ہوگا...... ورنہ...... یہ زرق برق کھنا میرے خاندان میں آتا کہاں سے...... یہ تو بڑے درباروں میں برسرِ محفل رکھا جاتا رہا ہوگا...... نہیں، اسے بیچ دیا تو میں اس نادر نمونے سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاؤں گا...... تبھی ذہن میں ایک ہیجان سا محسوس کیا اور حُقے پر سے ہاتھ ایک جھٹکے سے ایسے کھینچا، مانو ہزاروں وولٹ کا برقی جھٹکا

لگا ہو۔ یکا یک اُس کے لب تھر تھرائے۔

''نہیں، میں اِسے نہیں بیچ سکتا۔ یہ تو میرے بزرگوں کی آخری نشانی ہے۔''

اُس کی بڑبڑاہٹ سُن کر زونہ فکر انگیز خیالوں کے جھرمٹ سے نکل کر پھُسپھُساتی ہوئی ٹوک کر بولی۔

''سوتے کیوں نہیں؟

''نیند نہیں آرہی۔''

''کوشش تو کرلو۔ یونہی جاگ کر خون جلاتے رہنے کا کیا فائدہ۔''

''ذہن کو فکر واندیشوں نے جکڑ رکھا ہو تو نیند کیسے آئے گی۔ گذر بسر کی تدبیریں کر کر کے عقل سُن ہونے لگی ہے۔''

چاند کی نقرئی روشنی کھڑکی سے چھن کر کمرے میں داخل ہو چُکی تھی۔

رمضان جُو نے جواب دے کر حقہ گُڑگڑایا اور دھویں کا مرغولہ سا بنا کر چاند کی جھلملاتی شعاعوں پر چھوڑ دیا جو اُجلی پرت پر اپنی ہئیتیں بدلتا نیچے تا اوپر مچلتا بکھرتا پرواز کرتا چلا گیا۔ دھویں کی کڑوی کسیلی بُو بہک کر نیم دراز زونہ کے حساس نتھنوں سے ٹکرائی تو وہ کسی غصیل جانور کی طرح بدک کر اُس پر چڑھ دوڑی۔

''بند کیوں نہیں کرتے اِس بلائے جان کو...... ناک میں دم کر رکھا ہے...... ہم پر اپنی ہی بھوک کی مار پڑی ہے اور تم مُوئے دھویں کے ستم سے جان لے رہے ہو۔ دفع کر کے پھینک کیوں نہیں دیتے اِس دشمن کو...... کمبخت نے نیند ہی اُچاٹ کر کے رکھدی۔''

وہ اس کی برہمی پر کچھ نہ بولا۔ بُرے حالات میں چڑ چڑاپن مزاج میں در آنا قدرتی بات ہے۔ ایسے میں ٹوکنا یا ڈانٹ دینا جلتی پر تیل چھڑکنے کے مترادف ہوتا، گرہستی کی کشتی کو شعلوں کی نذر ہوتے دیر نہ لگتی...... بھلائی چپ رہنے میں تھی۔ وہ کوئی جواب دیئے یا ٹوکے بغیر صرف اِس گتھی میں اُلجھا رہا کہ نہ جانے اور کتنا عرصہ بے رحم حالات کے تھپیڑوں

سے جھوجھنا پڑے گا۔

پس منظر میں دُور کہیں احتجاجیوں کا نہ تھمنے والا شور مسلسل بُلند تھا۔ زونہ نے بے چینی کے مارے کروٹ بدلی اور جھنجھلا کر سوال کیا۔

''آخر اور کتنے دنوں تک رہے گا یہ ہُو ہلا؟''

''جب تک قاتل کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جاتا۔''

''تو کیا اُس ظالم کو قتلِ ناحق کی سزا ملے گی؟''

''کُچھ کہا نہیں جا سکتا...... اندھیر نگری نہ ہوتی تو بے تقصیر طالب علم کی موت ہی کیوں آتی۔''

''ہاں واقعی...... محض رُکنے کا اشارہ نہ دیکھ پانے کے بدلے میں گولی مار دینا سراسر ظلم ہے ناانصافی۔ ظالم نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ بھی کسی گھر کا چشم و چراغ ہوگا۔ کسی غریب ماں باپ کے دل کی ٹھنڈک ہوگی...... دیکھنا، ایک دن خدا کی بے آواز لاٹھی اُس جابر پر ضرور برسے گی۔''

''انشا اللہ...... مگر فلحال تو ہم خود بھکمری کا شکار ہیں۔ نہ جانے کن گناہوں کی سزا اپنے معصوم بے قصوروں کو بھُگتا رہے ہیں۔''

زونہ اُس کی بات سُن کر ٹھنڈی آہ بھر کے رہ گئی، پھر کچھ یاد کر کے پُر اُمید انداز میں بولی۔

''سُنا ہے...... کل کسی وقت کرفیو میں دو گھنٹے کی ڈھیل ہوگی۔ ایسا ہوا تو اعلان ہوتے ہی تم فوراً ٹھیکیدار کے پاس بقایا جات کی وصولی کے لئے چلے جانا۔ کیا پتہ پھر موقع ملے نہ ملے...... چار پیسے ملیں گے تو بھوک سے نڈھال ننھی بدنوں میں جان پڑ جائے گی۔''

''اُس سے کچھ ملنے کی کوئی اُمید نہیں ہے زونہ۔ وہ ٹال مٹول کرنے کا عادی ہے۔ میں نے فون پر معلوم کر لیا تھا، کہہ رہا تھا چیک کہیں اٹکی پڑی ہے۔''

''ارے مگر تمہارے خون پسینے کی کمائی تو دودھ میں ڈھل کر مل جانی چاہیے۔ اُسے تمہارے لئے کچھ بھی کر کے انتظام کر ہی لینا چاہئیے۔''

''ہاں بالکل...... پر نہیں کیا تو کیا کر سکتا ہوں۔ اُسے خدشہ ہے کہ میں حساب کتاب بے باک کر کے کہیں اُس کے کام سے ہٹ نہ جاؤں۔''

''عجب مطلبی انسان ہے...... اِن حالات میں کھلے دِل سے مدد کرنے کے بجائے تمہاری اُجرتیں دبا بیٹھا ہے۔ کل مجھے ساتھ لے چل۔ گھن چکر کو ایسا کھرا کھوٹا سناؤں گی کہ آئندہ اُجرت دبائے رکھنے سے پہلے دس بار سوچے گا کہ کہیں پھر سے مٹی پلید نہ ہو جائے۔''

''رہنے دے زونہ، بد بخت ایسا دومنہا سانپ ہے کہ کچھ بھی کہنے کا اُس پر اثر نہ ہوگا۔''

''تو پھر ایک کام کر رمضان جُو...... میری یہ انگوٹھی فروخت کر دے۔''

''اری کیا کہتی ہو...... یہ سگائی کی انگوٹھی ہے، ہمارے روشن ازدواجی زندگی کی نشانی...... اِسے بیچ دیا تو بدشگونی ہو جائے گی۔ میں یہ منحوس کام نہیں کر سکتا۔''

''تم اِن کم سِنوں کی مُردنی حالت دیکھتے ہو نا۔ دیکھو کیسے مُرجھا گئے ہیں۔ مجھ لاچار سے معصوموں کی تڑپ اور نہیں دیکھی جاتی...... خدا کے لئے اِسے بیچ کر اِن کی بھوک مٹانے کا سامان کر دو...... ہاں رمضان جُو اچھے دِن پھر گئے تو میرے لئے ایک اور خرید لینا۔''

''نہیں...... یہ مجھ سے بالکل نہ ہوگا۔''

زونہ کچھ دیر اُس کی جانب متانت سے دیکھتی رہی، پھر کروٹ بدل کر شوخ لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے چلو یہ نہ سہی...... ایک اور بھی چیز ہے بیچنے کی۔ تم چاہو تو روزی روٹی کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ مگر اِس کے لئے کِسی مال دار اسامی کی ضرورت ہوگی، جو موٹی رقم دینے کو راضی ہو اور...... راز کو بھی سینے میں دبائے رکھے۔''

زونہ کے گول مول اشارے پر وہ چونک پڑا......کسی بیہودہ مطلب کے خیال
سے اُس کا رُواں رُواں کانپ گیا۔ اُس کی دانست میں سونے کی انگوٹھی کے سِوا گھر میں اور
کوئی چیز بیچنے لایق تھی ہی نہیں ......تو پھر زونہ کا اشارہ کس چیز کی طرف تھا......کہیں اس کا
ارادہ اپنے ناموس کو داؤ پر لگانے کا تو نہیں ...... اِس خیال سے ہی تن بدن میں آگ لگ
گئی...... ماتھا ٹھنکا...... تیوریوں کی ناگوار لکیریں اور گہری ہوگئیں۔ وہ غصے میں بھڑک اُٹھا۔

''ہوش تو ٹھکانے ہیں تمہارے ...... اِس سے پہلے میں تم کو زہر دے کر مار
نہ دوں۔''

''ہونہہ......'' وہ بھی جل بھُن کر غرّائی۔ ''گھر میں اناج کا دانہ نہیں اور تم چلے زہر
دینے۔ کہاں سے لاؤ گے زہر کے پیسے......؟''

''چُپ کر کمینی...... تجھے جان مرگ کرنے کے لئے زہر کی ضرورت نہیں پڑے
گی۔ رسوئی کے چاقو سے ہی کاٹ ڈالوں گا۔''

زونہ اُس کے تیکھے رَویے پر حیرت میں ڈوبی، پھر غصّے کو بھانپ کر محتاط لہجے
میں بولی۔

''ارے مگر کیوں مارو گے مجھے......کوئی قصور تو ہو میرا۔ میں تو اِن بچوں کے لئے
بولی تھی۔''

''چپ کر بے شرم۔ تمہارے گھٹیا دماغ میں اپنی نیلامی کا بیہودہ خیال آیا ہی
کیوں۔؟''

''چھی چھی چھی......؟''

زونہ تلملا اُٹھی اور غصے میں چیخ کر برس پڑی۔

''کیسی گھٹیا بات سوچی تم نے ......توبہ توبہ ......اتنی گئی گذری نہیں ہوں
رمضان جُو۔ اِس خیال کے آنے سے پہلے میری موت کیوں نہ آئی......ارے میں تو اپنے

ازلی سوتن تمہارے اِس حُقّے کی بات کر رہی تھی، جسے پھونک کر تم بلغم اگلتے رہتے ہو......تم سے تو خدا سمجھے۔''

رمضان جو پر حقیقت کھُلا تو اپنی ناقص سوچ پر نادم ہو کر بغلیں جھانکتا رہ گیا۔ بیوی سے نگاہیں ملانے کی جُرات جاتی رہی...... وہ جھنجھلاہٹ میں ہاتھ کی انگلیاں چٹخارتے ہوئے حقّے کا گہرا کش لے کر چھوڑتا ہوا دھیرے سے بُدبُدایا۔

''اُف......میں پریشانی کے مارے سٹھیا گیا ہوں۔''

''سچ مُچ سٹھیا گئے ہو، ورنہ ایسی بکواس نہ کرتے......لعنت ہے تمہاری گھٹیا سوچ پر۔''

ابھی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ کھانسیوں کے پے در پے ٹھسکوں نے اُس کی حالت خراب کر دی۔ دم گھُٹنے لگا۔ آنکھیں پھوٹنے سی لگیں......شوہر کی بگڑتی حالت پر زونہ پھرتی سے اُٹھ کر اُس کی چھاتی سہلانے لگی......اُس کی ناگوار آنکھوں میں اب نفرت کے بجائے درد اُتر آیا تھا۔ وہ چھاتی سہلاتی ہوئی جھنجوڑ کر بولی۔

''تم نے کوئی جواب نہ دیا...... یاد رکھو، یہ حُقّہ تمارے دُکھ سُکھ کا ساتھی کبھی نہیں بن سکتا۔ ہاں اِسے بیچ کر موجودہ پریشانیوں سے چھٹکارا ضرور مِل سکتا ہے۔ بھوکے بچوں کی تڑپ مٹ سکتی ہے۔''

''لیکن زونہ......''

رمضان جو دم سنبھالتے ہوئے بولا۔

''یہ میرے آبا واجداد کی اکلوتی نشانی ہے، اور قسمت سے میرے پاس بطور امانت آئی ہے۔''

''آئی ہے تو نسلوں کو مٹانے کے بعد...... بزرگان اور تمہارے امّی ابّا کو ڈھیروں مِٹی تلے سُلانے کے بعد......تحفہ نہیں......ملک الموت کا ایلچی بن کر آیا ہے......اور اب......

دھیرے دھیرے تجھے بھی اندر ہی اندر گھلانے لگا ہے...... ارے۔ اِدھر فاقے لگے ہیں اور تجھے اِس ظالم بلا کی پڑی ہے...... لوگ اپنے پریوار کو بچانے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتے۔''

''خدا کے لئے زونہ...... چیڑ چیڑ کر کے میرا دماغ نہ چاٹو۔ میں پہلے ہی پریشان ہوں۔ تجھے اِس خوبصورت حُقے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا تو بیکار کا لیکچر نہ جھاڑتی...... نادان عورت اِس بیش قیمتی نمونے کا مول تول نہیں کیا جاسکتا۔''

''تبھی تو کہتی ہوں، کوئی مالدار اسامی دیکھ کر سودا کرلو۔ ورنہ بنائے رکھو من کا روگ، اور بھاڑ میں جاؤ۔''

وہ جتن کر کے ہاری اور من کو مار کے دہائی دیتی ہوئی بڑبڑائی۔

''میرے خدا...... صبح چولھے پر چڑھانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ جانے اب کیا ہوگا میرے بچوں کا۔''

رمضان جو اُسے سرہانے میں مُنہ دبا کر بھبکتے اور اناپ شناپ بکتے دیکھتا رہا۔ پھر اس کی پرواہ کئے بغیر حُقّے کے منقش گل بوٹوں کو اوپر نیچے چھو کر انجانی سی راحت محسوس کرنے لگا۔ اِس راحت میں نشے کی وہ نفسیاتی کشِش اثر پذیر تھی۔ جِس کے ہوتے حُقے کی جدائی نا قابل برداشت لگ رہی تھی...... واقعی اور باتوں کے علاوہ یہ حُقہ چلم سے حُقے کے پیندے تک خوبصورت گلکاری سے منقش اور گھٹے سے کللکی تک، زریں دھاگوں کی آمیزش اور ننھی مُنی آہنی جھالروں کی زیبائیش سے مُزّین زمانہ قدیم کی دیدہ زیب کاریگری کا ایک نادر نمونہ تھا۔

زونہ کی بات کو یکسر جھٹکنے کے باوجود انگوٹھی اور حُقے کی کشمکش اِس کے شعور کو بڑی دیر تک جھنجوڑتی رہی۔

رات کافی بیت چکی تھی۔

پس منظر کا شور مدھم پڑ چُکا تھا۔

زونہ ہار مان کر نیند کی وادیوں میں اُترتی چلی گئی۔ فرحت بخش ہواؤں کے جھونکے

اِس کی زُلف پریشان کو چھیڑتے رہے۔ رمضان جُو تذبذب کے عالم میں سر تھام کر حقہ گڑ گُڑا تا رہ گیا۔

☆

کئی بے چین راتوں کی طرح یہ رات بھی جیسے تیسے گُزر گئی۔

اگلی صبح سُورج اُگ آیا تو مُردہ دِلوں میں اُمیدوں کا نیا رنگ چڑھنے لگا۔

پرندوں نے چہکار کر نغمے سُنائے ...... رمضان جُو کے اُداس بچوں کو اِن دل پسند نغموں کی کوئی رغبت نہ تھی۔ وہ تو جاگتے ہی بھوک سے بلکنے لگے۔ اِن کی تڑپ دیکھ کر زونہ بچا کھچا اناج تلاش کرنے کے لئے پاگلوں کی طرح مکان کے اوپر نیچے دوڑی۔ اِس بیچ بجلی آگئی تو فوراً بچوں کی تسلّی کے لئے ہیٹر پر نہ صرف پانی کی پتیلی رکھ دی، بلکہ خالی خولی ڈبوں کو دیوانہ وار کھنگالنے بھی لگی۔ دس سالہ طارق بھی امّاں کا ہاتھ بٹانے میں جُٹ گیا۔ روتی بلکتی بچیاں گھونسلے کے ننھے مُنھے چوزوں کی طرح مُنہ پھاڑے آس و یاس بھری نگاہوں سے امّاں کی حرکتیں دیکھتی رہیں۔ ایک ڈبے سے گُڑ کے چند ٹکڑے نکلے جو اُبلتے پتیلی میں ڈال دیئے گئے۔

اچانک ایک گرجتے اعلان نے مُرجھائے دِلوں میں جیسے جان ڈال دی...... زونہ نے ہمہ تن گوش ہو کر سُنا، پھر چہک کر رمضان جُو سے مخاطب ہوئی۔

"دیکھا، میں نہ کہتی تھی، کرفیو میں ڈھیل ہو گی...... لو اب بھی کہتی ہوں، میری یہ انگوٹھی بیچ آؤ......"

"ہاں زونہ...... اب کی بار تو کچھ کرنا ہی ہو گا...... پہلے میں باہر کی ہوا دیکھ آتا ہوں۔"

رمضان جُو سُدھ بُدھ لینے تیزی سے نکل گیا...... بھاگا بھاگا چوک میں پہنچا۔ بازار میں جم غفیر سا اُمنڈ چکا تھا...... سبھی عُجلت میں ادھ کھلی دکانوں اور چھاپڑی فروشوں کی

طرف دوڑ رہے تھے......سوداگروں، سبزی، دوا، میوہ فروشوں کے ادھ کھلی دکانوں پر بھیڑ جم چکی تھی۔ سبھی آپا دھاپی میں لگے تھے......آسودہ حال حضرات ضرورت کے سامان لادلاد کر چلے جارہے تھے۔ تنگ دستوں اور بے نواؤں کی بھی کمی نہ تھی۔ بیچارے حیران و پریشان سوالی نگاہوں سے کسی حاتم سخی کی اُمید میں مُنہ پھاڑے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔

لوگوں کا جا بجا جمگھٹا......

جھٹ پٹ کام نپٹانے کی کوشش......

تیزی سے بھاگتی موٹر گاڑیاں......

ہر طرف ایک تانتا سا، مانو شہر میں زندگی لوٹ آئی ہو۔

یکا یک رمضان کے سامنے ہی ایک راہ چلتے آدمی کا ہاتھ میں پکڑا پالی تھین کا تھیلا کنارے سے ذرا سا پھٹ گیا۔ اِس میں سے ترکاریاں گاجر، مولی، آلو پیاز نکل کر پٹری پر اِدھر اُدھر بکھر گیئں۔ انہیں دیکھ کر اُس کے من میں ہوک سی اُٹھی، کہ کاش۔! ۔ وہ اُنہیں یونہی چھوڑ کر چلا جائے، اور اُسے سمیٹ کر گھر لے جانے کا موقع ملے......مگر، اُس کی حالت تب مسخرے سی ہوگئی جب وہ شخص تیزی سے بکھری ترکاریوں کو سمیٹ کر شانِ بے نیازی سے چلتا بنا، یوں جیسے کوئی اُڑتی چیل زمین پر سے آنکھوں دیکھے شکار کو پھرتی سے اُچک لینے کے بعد پھر سے نکل جاتی ہے۔

وہ ٹھنڈی آہ بھر کے بغلیں جھانکتا رہ گیا۔

زونہ مُسلسل ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پتیلی کے اُبلتے پانی کو جواب گُڑ کی آمیزش سے شیرے میں ڈھل چُکا تھا، گاڑھا ہونے سے بچانے کے لئے بار بار پانی ملا رہی تھی۔ کمرہ شیرے کے بھاپ سے پھیلی بُو سے آلودہ ہو چُکا تھا......تینوں بچے شیرے کی بدمزگی کے خیال سے مُنہ بسورے کبھی اُبلتے پتیلی اور کبھی اماں کو تک رہے تھے......خود زونہ کا جی بھی

شیرے کی ناقابل برداشت بُو سے متلا یا ہوا تھا۔ وہ دیر تک بچوں کی باطنی حالت محسوس کرتی رہی، پھر بے قرار ہو کر طارق سے مخاطب ہوئی۔

''بیٹا، تمہارے ابا نہ آئے اب تک......! دوپہر ہونے کو ہے۔ آجاتے تو پتہ چلتا، کھانے کھلانے کو روپے ملے بھی ہیں یا نہیں۔''

روپے کی بات سُن کر معصوم طارق کا ذہن جاگا۔ ایک انجانی اُمید نے اُسے چوکنا کر دیا۔ اُس نے کہیں دوستوں میں سُن رکھا تھا کہ پتھراؤ ختم ہونے کے بعد پُل کے نیچے کوڑے کباڑ کے ڈھیر کی آڑ میں چھُپ کر سنگباز ٹولے میں روپے بانٹے جاتے ہیں......اب یہ بات سچ تھی یا جھوٹ...... جائز تھی یا غلط......ان سب کی پرواہ کئے بغیر وہ روپے کی طلب میں کوئی پل ضایع کئے بغیر سپرنگ کی طرح اُچھلا اور ''ابھی آیا اماں'' کہہ کر کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح گلی کی طرف بھاگا۔ گلی سے نکڑ اور نکڑ سے مرکزی چوک پر پہنچا...... چوک کے سرگرم جم غفیر پر سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد کچھ یاد کر کے پُل کی طرف بڑھا......پُل کے کنارے رُک کر مُتلاشی نگاہیں نیچے برلب دریا پڑے اُس ڈھیر کے اغل بغل میں دوڑا دیں، جس پر مقامی میوہ فروش آوارہ چوپائیوں کے لئے چھانٹن چھوڑ جایا کرتے تھے۔

وہ ہمت کر کے اِدھر اُدھر دیکھتا، کچھ ڈرتا، کچھ ہچکچاتا بغل کی سیڑھیوں سے نیچے اُترا، اور کباڑ کے ڈھیر کے آس پاس چرندوں کے درمیان پتھر بازوں کی ٹوہ لینے لگا، اور جب کِسی کو نہ پایا تو مایوسی کے عالم میں فرشِ خاکی پر بیٹھ کر قریب پڑے سنگریزوں کو انگلیوں سے چھیڑنے لگا...... اِس کے معصوم سے دماغ میں رہ رہ کر یہ حسرت گردش کرنے لگی کہ آج اگر چند پتھروں کے عوض کچھ روپے مل جاتے تو کم از کم اماں کو دے کر بہنوں کی بھوک مٹائی جاسکتی تھی۔

وہ اِس سوچ میں اِدھر اُدھر ہاتھ مار ہی رہا تھا کہ اوپر سڑک پر پُل پار سے آتی بکتر بند گاڑی پر سنگبازوں کی یلغار ہوگئی...... طارق فوراً سنبھلا......کِسی خیال سے جھٹ پٹ اپنا

میلا دامن الم غلم سے بھر دیا...... ٹیر گیس کا دہانہ کُھل چکا تھا۔ ایک آدھ فائیر داغے جا چکے تھے۔ اِس افراتفری میں دکانوں کے شٹر دھڑا دھڑ گرے...... لوگ چھپنے کو سر پر پیر رکھ کر بھاگے...... رمضان بھی نکڑ کی طرف دوڑا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سڑک سنسان پڑ گئی۔

اِس ہڑ بونگ میں گھبرایا ہوا طارق کچھ دیر پُل کی آڑ میں دُبکا پڑا اِس تذبذب میں اُلجھا رہا کہ بھاگنے سے پہلے دامن کو جھٹک دے یا یونہی لے کر دوڑے۔ تبھی ہمّت کر کے موقع دیکھ کر قمیض کی جھولی کا دامن کس کر تھامے سڑک کی جانب دوڑا ہی تھا کہ دکان کی اوٹ میں کھڑے چاق و چوبند سپاہی نے گردن کے کالر سے پکڑ کر روک لیا۔

گلی کے نکڑ سے رمضان جُو کی نگاہ فوجی کی گرفت میں پھنسے لختِ جگر پر پڑی تو اُس کے بھرے پُرے قمیض کے دامن کو دیکھ کر انہونی اندیشے کے مارے یہ سوچ کر وسوسے میں ڈوب گئی کہ ضرور کِسی نے لالچ دے کر معصوم ذہن میں تخریبی شیطانیت بھر دی ہوگی۔ ورنہ اُسے ان باتوں کی کیا سمجھ...... ابھی تو اُسے بھلے بُرے کی پہچان ہی نہیں۔ ننھی سی جان کے ساتھ اب نہ جانے کیا سلوک کیا جانے والا ہے"۔ وہ فکر و تردد کے مارے ہاتھ ملنے لگا۔

اُدھر ٹیر گیس کی آواز سُن کر زونہ بھی بیٹے کی تلاش میں گلی کی اور دوڑی، وہ نُکڑ پر کھڑے رمضان جُو کے قریب پہنچی ہی تھی کہ جگر کے ٹکڑے کو فوجیوں کے گھیرے میں پا کر سینے پر دو ہتھڑ مارتی ہوئی شکوہ آمیز لہجے میں بولی۔

"ہائے رمضان جُو...... کتنے کٹھور ہو تُم۔ انگوٹھی یا تھے میں سے کوئی ایک چیز بیچ دی ہوتی تو میرے لختِ جگر پر یہ نوبت تو نہ آتی۔ ہائے اب کیا ہوگا۔ کہیں یہ لوگ اپنا غصّہ اِس معصوم پر نہ جھاڑ دیں۔"

رمضان جو دِل تھام کر سُنتا رہا۔ اُس کی ساری توجہ بیٹے پر مرکوز تھی۔

اُدھر گھبرایا ہوا طارق رونی صورت بنائے معصومیت سے فوجی کی طرف دیکھ رہا

تھا۔ فوجی کچھ دیر اُسے گھورتا رہا...... پھر کڑک کر پوچھا۔

''تم بھی، پتھّر مارتے ہو۔؟''

''نن نہیں جی...... میں پتھر نہیں مارتا۔''

خوف کے مارے کپکپاتے ہوئے جواب دینے کے بعد وہ اُس بارعب آفیسر کی جانب دیکھنے لگا جو تیزی سے قریب آ رہا تھا...... اُس نے بھی آتے ہی رعب جھاڑ دیا۔

''بدمعاش...... جھولی میں اتنے سارے پتھر بھر کے بھی کہتے ہو، میں پتھر نہیں مارتا۔''

''نہیں نہیں جی...... میں پتھر نہیں مارتا......''

''تو کیا یہ پتھر چبانے کے لئے اُٹھائے ہیں۔؟ اُلو کے پٹھے۔''

اس کے ساتھ ہی فوجی آفیسر کے ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ اُس کے گال پر پڑا کہ آنکھوں میں تارے ناچ اُٹھے۔ قمیض کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور سارے ادھ سڑھے سیب رستے پر بکھر کر آفیسر کا مُنہ چڑھانے لگے...... تبھی زیادتی کے احساس سے فوجی کا دل پسیجا۔ اپنی بدگمانی پر خفت سی محسوس کرتے ہی قمیض کے کالر کی گرفت ڈھیلی کر دی۔

فوجی کے چنگل سے چھوٹتے ہی طارق ایک چیخ کے ساتھ نکڑ پر کھڑی ماں کی اور بھاگا۔ زونہ نے لپک کر سینے سے لگاتے ہوئے بلائیں لیں اور جھٹ سے انگوٹھی اُتار کر رمضان جُو کی جانب بڑھاتی ہوئی دوٹوک لہجے میں بولی۔

''اب بھی کچھ نہیں بگڑا رمضان جُو...... یہ لو...... جا کر بیچ دو اِس انگوٹھی کو، اور جلدی سے اِن کی بھوک مٹانے کا سامان کر دو۔''

بیٹے کی حالت اور زونہ کے تیکھے رویے پر رمضان جُو کی آنکھیں ندامت سے بھر آئیں۔ وہ بچے کو جی بھر کر پچکارتے ہوئے جذباتی لہجے میں بولا۔

’’نہیں زونہ، بیکار کا حُقّہ ہوتے ہوئے پیار کی یہ نشانی نیلام نہیں ہو سکتی۔ اِس سے تو میرے جینے کی آس بندھی رہتی ہے۔‘‘

تبھی وہ جھٹ سے اُٹھا اور کوئی پل ضائع کئے بغیر گھر کی طرف بھاگا۔

کرفیوں میں ڈھیل کا وقفہ گھٹتا جا رہا تھا۔

............☆☆☆............

کوّے کی دانائی (ذاتی مشاہدہ)

درسی نصابوں میں کوّے کی دانائی کا ذِکر عموماً مختصراً و طولاً دوسری یا تیسری جماعت سے ہی اردو و انگریزی کتابوں میں پڑھنے اور سُننے کو ملتا ہے۔ اردو میں اِس کی کہانی ''چالاک کوّا'' یا ''پیاسا کوّا'' اور انگریزی میں "The Clever Crow" یا "Thursty Crow" کے عنوان سے رقم ہے۔ دونوں قسموں کے مضمونوں میں کوّے کی پیاس بجھانے کی ترکیب کا ذکر ایسی حُسن خوبی کے ساتھ قلمبند ہے کہ عقل انسانی اِس چھوٹی سی جان کی حکمت عملی پر دنگ ہوئے بناء نہیں رہتی، یعنی پیاس کا مارا یہ کوّا پانی کی تلاش میں جا بجا خوب بھٹکنے کے بعد کسی پارک یا باغ میں پہنچ کر ایسے مٹکے یا لوٹے کے قلیل پانی سے اپنی پیاس بجھانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ جس کی سطح آب تک کوششوں کے باوجود بھی اِس کی چونچ پہنچ نہیں پاتی...... تب وہ اپنی تدبیر کا استعمال کر کے آس پاس بکھرے کنکروں کو چُن چُن کر یکے بعد دیگرے اُس وقت تک مٹکے یا لوٹے میں ڈالتا جاتا ہے جب تک کہ پانی کی سطح اُبھر کر اسکی پیاس بجھا نہیں لیتی۔

بے شمار کتابوں میں چرندوں پرندوں سے متعلق من گھڑت کہانیوں کے علاوہ کتنی ہی سچی اور دلچسپ کہانیاں موجود ہیں جس کی صداقت پر عقل یقین نہیں کرتی۔ حالانکہ قدرت کے عجائبات واقعی نرالے ہیں۔ میں نے کوّے کے بارے میں ذاتی مشاہدے کے بعد ''پیاسا کوا'' یا ''چالاک کوّا'' کی بے مثال کہانی پر یقین کر لیا ہے۔

میرا ماننا ہے کہ زندگی کے میدان میں ہار کر مایوس ہونے والے لوگ کوّے کی کہانی یا اس طرح کی دوسری کہانیوں کو پڑھ کر پھر سے تازہ دم ہو سکتے ہیں اور پھر جتن کر کے میدانِ

عمل میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ سکتے ہیں۔

سبھی جانور عقل رکھتے ہونگے۔ لیکن کوئی واقعی دانا یا چالاک ہوتے ہیں، اِس کا مشاہدہ ایک بار اتفاقاً ہی کرنے کو ملا۔

ہوا یہ کہ گرمیوں کی ایک اتوار کے دِن میں حسب معمول دومنزلہ سرکاری رہائیشی عمارت جو کہ صفا کدل سرائے کے نام سے برلب دریائے جہلم موجود ہے، کے بڑے سے آہنی صدر گیٹ سے باہر نکلا اور سامنے بنے جدید طرز کے کنکریٹ پل پر جاری آمدورفت اور لوگوں کی گہما گہمی کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ کیوں نہ سڑک پر جا کر بازار کی رونق سے جی بھر کر لطف لیا جائے یا پھر اکتاہٹ مٹانے کے لئے دریائے جہلم کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر سطحِ آب پر اُچھلتے، مچلتے، چھٹپٹاتے چھوٹی بڑی مچھلیوں کا دلکش منظر دیکھ دیکھ کر وقت گذارا جائے کہ میرے قریب سے کوئلے کی مانند بالکل سیاہ چمکیلا ایک کوّا مجھے نظر انداز کرتا ہوا پھُدک پھُدک کر پُل کی دیوار کے ساتھ بہنے والی گندی کیچڑ بھری نالی کے قریب چلا گیا۔ شاید اُسے میری شرافت پر یقین تھا یا پھر کہیں آس پاس ہی آشیانہ بنائے رکھنے کی وجہ سے میرے عادات و اطوار سے واقف رہا ہوگا کہ میری موجودگی سے گھبرائے اور پریشان ہوئے بغیر کیچڑ بھری گندی خستہ حال نالی کے کنارے کنارے اِدھر اُدھر پھُدکتا ہوا کھانے کی تلاش میں جُٹ گیا ۔ یہ کچی نالی پُل کی پٹری کی دیوار کے عین دس بارہ فٹ نچلے کنارے سے لگ کر بہتی ہوئی دریائے جہلم پر بنے گھاٹ کے ڈھلوان سے اُتر کر دریا کی روانی میں جاملتی ہے۔ آج یہ نالی سیمنٹڈ بنائی جاچکی ہے۔ جبکہ کچھ مُدّت پہلے اِس کے دو متوازی کناروں میں سے ایک کنارے کی لمبی گیلی پٹی سیمنٹڈ نہ ہونے کی وجہ سے مزید فٹ بھر کی خشکی کو نمی سے تر بہ تر کر کے آلودہ اور بدبودار بنا چکی تھی ...... اُس پر طُرہ یہ کہ سبزی اور میوہ فروش دکانداروں و دیگر مقامی و غیر مقامی لاپرواہ لوگوں کی جانب سے نالی میں پھینکے گئے پھل...... ترکاری ...... کپڑوں کے چیتھڑے...... ردی اخبار ...... گتوں کے ٹکڑے ...... رنگ برنگی پالی تھین کے لفافے اِس طرح

اُبھرے اور دھنسے پڑے تھے کہ ان میں چھوٹے بڑے کیچوؤں کی بھر مار نے بدبو اور سڑاند پیدا کر کے یہاں سے گذرنے والے ہر بشر کو اپنے اپنے نتھنے سنبھالنے پر مجبور کر دیا تھا۔

چونکہ سارے لوگ لا پرواہ نہیں ہو سکتے اسلئے چند عاقبت اندیشوں نے اتنی مہربانی ضرور کی تھی کہ اپنے دکانوں اور گھروں سے نکلنے والے کوڑے کرکٹ کو وقتاً فوقتاً لا کر دلدلی نالی میں بکھیرنے کی بجائے پُل کے نیچے برلب دریا خشکی پر اِس طرح ڈال دیا تھا کہ روز روز کے ڈالنے سے سارا کچرا اونچا ہو کر ٹیلے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ کوڑے کا یہ ڈھیر یا ٹیلہ مونسپلٹی کی نظروں سے اوجھل پُل کے عین نیچے خلوت کدہ سے کم نہ تھا۔ لوگ اِس طرف کم ہی جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ موقع بے موقع کتّوں، بلیوں، چوہوں، پرندوں اور پالتو مُرغیوں کا اِس ٹیلے پر راج رہتا...... جو کبھی تو اناج کی کھوج میں اِدھر اُدھر مُنھ مارتے رہتے اور کبھی ایک دوسرے پر جھپٹنے کی تاک میں انداز بناتے رہتے۔ کبھی کبھی ان کے ایک دوسرے پر جھپٹنے سے ہڑبونگ سا مچ جاتا اور کھلبلی میں سارے جانور پرندے گھبرا کر جان بچانے کے لئے نو دو گیارہ ہو جاتے۔ لیکن پھر فوراً ہی نفس کی آگ بُجھانے کے لئے سب کچھ بُھلا کر دوبارہ وارد ہو جاتے اور حالات پہلے کی طرح ایسا بحال ہوتا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

میں کچھ سوچ کر کوئے کو دلدلی نالی کے پاس تنہا چھوڑتا ہوا دریا کے سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ کِسی زمانے میں یہ جگہ دریائی آمد و رفت کا گھاٹ ہوا کرتی تھی۔ یہاں چھوٹے بڑے شکاروں اور کشتیوں میں سبزیاں، لکڑیاں، اینٹ، چونا، پتھر وغیرہ فروخت کرنے، لادنے، ڈھونے اور دُھلائی کرنے والوں اور دھوبیوں کا راج رہتا تھا۔ جم کر خرید و فروخت ہوتی تھی۔ لیکن اب کشادہ سڑکوں اور کھلی خوبصورت بازاروں و مشینی گاڑیوں کی آمد و رفت کی وجہ سے ایسے گھاٹ اپنی اہمیت کھو کر ویران پڑ چکے ہیں۔ آج شاید ہی کِسی شخص کو اِس گھاٹ کی سرگرمیوں اور چہل پہل کے بارے میں یاد ہوگا...... اب یہاں محلے کی

مستورات کبھی کبھار ہی بھاری قِسم کے کمبل، بچھونے اور کپڑے دھونے کے لئے آتی ہیں یا
پھر چلچلاتی دھوپ میں گرمی سے بے حال ہوئے نوجوان چھوکرے دریا کی روانی میں ڈو
بکیوں کا مزہ لیتے نظر آتے ہیں۔ اب اِس اور اِس جیسے دوسرے گھاٹوں کا نقشہ ایسا ویران پڑ
چکا ہے کہ تازہ سزیوں سے لدی اور خریداروں سے لین دین کرتی ہوئی خوبصورت شکاروں کا
ویسا دلکش منظر شائد ہی کبھی دیکھنے کو مِل سکے۔

گھاٹ کی چند سیڑھیاں نیچے جانے کے بعد، میں پتھریلی سیڑھی کے ایک ایسے
سِل پر جا بیٹھا، جہاں سے میرے عقب میں اوپری سطح زمین پر آہنی گیٹ کے مدمقابل
والی دلدلی نالی میں کوئے کی جانب سے ہونے والی سرگرمی میری آنکھوں کے ٹھیک نشانے
پر رہی اور بائیں جانب ٹھیک میرے قریب ذرا سے فاصلے پر بالکل برلب دریا کوڑے
کرکٹ کے ڈھیر پر کھوجنے والے پرندوں اور آوارہ جانوروں کی آنکھ مچولی کا منظر بھی
صاف دکھائی دینے لگا۔

کوئے کو شاید دلدلی نالی میں سے کچھ نہ ملا تھا تبھی وہ دھیرے دھیرے پھدکتا ہوا
پُل کی سِلیب کے نیچے والے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کی طرف چلا آیا...... یہاں کتوں کے سوا
کئی قِسم کے جانور پیٹ کی آگ بُجھانے والی اَجناس کی کھوج میں سرگرداں تھے۔ کوئے نے
بھی ان کے بیچ گھُس کر نصیب کے چند دانے چُگ لئے۔ پھر مزید چگنے کی چاہ میں اِدھر اُدھر
ڈھونڈتا ہوا کوڑے کے ڈھیر کے اوپری حصّے پر چڑھ آیا۔ جلدی ہی اُس کی نگاہ کئی دِن کے
سوکھے ایک ایسی کڑک تندوری روٹی (جِسے کشمیری زبان میں ژوچ ور کہتے ہیں) پر مرکوز ہوگئی
جِسے چند بلیاں نوکیلے دانتوں سے توڑ کھانے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد چھوڑ گئیں
تھیں۔ اور اب مرغیاں باری باری اُلٹ پلٹ کر ٹھونگیں مارنے اور پٹخ پٹخ کر توڑنے کی کوشش
میں مصروف تھیں۔ پالش کے بڑے سے گول ڈبے برابر اِس سوکھی اور اکڑی ہوئی روٹی کو
دیکھ کر کوئے کے منھ میں پانی بھر آیا۔ وہ ڈھیر سے اُتر کر اِن کے قریب چلا گیا اور گھس

پیٹیوں کی طرح بچتا بچاتا خود بھی ٹھونگیں مار مار کر طبع آزمائی کرنے لگا۔ جلدی ہی مُرغیاں ناکام ہو کر دوسری طرف چلی گئیں۔ کوئے کو بھی کوششوں کے بعد اِس روٹی کے نہ ٹوٹنے کا پورا یقین ہو گیا۔

میں کوئے کی عقلمندی اور چالاکی کے بارے میں پڑھ چُکا تھا...... میری دلچسپی اِس کی حرکتوں پر مزید بڑھ گئی۔ اسلئے انجام جانے بناء وہاں سے نہ اُٹھنے کا من بنالیا۔

کوّا سوکھی روٹی چھوڑ کر ایک بار پھر کوڑے کے ٹیلے پر چڑھ آیا۔ اُس نے پھُدکتی چال میں گھوم گھام کر نہ صرف آس پاس کا بلکہ چھتوں اور دیواروں کا بھی جائزہ لے ڈالا۔ جب وہاں کسی دوسرے جھپٹنے والے پرندے کی موجودگی کا خطرہ دکھائی نہ دیا تو ایک ہی اُڑان میں نیچے اُتر کر کڑک روٹی کو چونچ میں دبایا۔ اب جو دوبارہ اوپر کی جانب اُڑان بھرنے کی کوشش کی تو روٹی کے بھاری پن کی وجہ سے ناکامی ہوئی۔ لیکن وہ...... ہار ماننے والا کب تھا...... ناکامی کا منھ دیکھ کر دوسرے پرندوں کی طرح لوٹ جاتا تو اسکی دانائی سے متعلق ساری کہانیاں میری نگاہ میں مشکوک ہو کر رہ جاتیں...... لیکن اُس کی حوصلے کی داد دیجئے کہ ہمت ہارنے کے بجائے دھیرے دھیرے گرتے سنبھلتے روٹی کو بالائی سطح پر لانے کی سر توڑ کوشش کی۔ بڑی مشکل سے اوپر پہنچا تو دلدلی نالی کے ایسے کنارے پر جا رُکا جہاں نالی کے بیچوں بیچ ہلکے نیلے رنگ کا ایک پالی تھین بیگ کیچڑ میں دھنسا پڑا تھا۔ جانے کیا سوچا کہ روٹی کو نالی کے دلدلی گیلی جگہ میں ڈال کر چونچ کی مدد سے پالی تھین کو کھینچنے کی کوشش کی۔ یکا یک نگاہ نالی میں پڑے ایسے چیتھڑے پر جا ٹھہری جو پانی سے تر بہ تر تھی۔ اب پالی تھین کو نظر انداز کر کے چیتھڑے کی طرف جھپٹا، اور بڑی محنتوں سے اسے کھینچ کھانچ کر روٹی کے قریب لے آیا۔ دوسرے ہی پل تیزی سے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے روٹی کو گیلے چیتھڑے سے ڈھک دیا اور روپوش ہو گیا۔ ایسا کرتے ہی میری چھٹی حِس بیدار ہو گئی میں نے بھی چھتوں

اور ہائی ٹینشن تاروں کی جانب یہ سوچ کر نظر دوڑائی کہ کہیں کسی پرندے کی نگاہ اسکی حرکتوں پر تو نہیں پڑی۔ خیر سے وہاں کوئی پرندہ موجود نہ تھا۔ مجھے اندازہ کرنے میں دیر نہ لگا کہ وہ اپنی دانست میں اکڑی ہوئی روٹی کو بھیگنے کے لئے چھوڑ گیا ہے تاکہ کسی پل واپس لوٹ کر آرام سے نوش فرما سکے۔

اِس ذاتی مشاہدے سے میری دلچسپی مزید بڑھ گئی کہ میں نے اُسکے لوٹنے تک مشاہدے میں رکھنے کا مُصمّم ارادہ کرلیا۔ یہ ایک صبر آزما کام تھا اور اتنا سارا وقت انتظار میں گذارنے کے لئے دل گُردہ چاہیئے تھا۔

میں پتھر کی سِل سے اُٹھا۔ دریا کی سیڑھیاں چڑھا اور خراماں ٹہلتا ہوا آہنی گیٹ کے رستے اندر جاکر بلڈنگ کی دوسری منزل کی ایک کھُلی کھڑکی پر جگہ سنبھالی۔ اب یہ چیتھڑا ٹھیک میرے نشانے پر تھا۔

وقت کی سوئی چلتی رہی۔

پل، منٹوں اور گھنٹوں میں بدلتے گئے۔ میری بیقراری بھی گذرتے وقت کے ساتھ بڑھتی گئی......

کوئی دو گھنٹے پہلے یعنی تین بجے میں نے کھڑکی پر مورچہ سنبھالا تھا اور اب سات بجنے کو آئے تھے۔ تب سے اب تک چار گھنٹے بیت چکے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ جھلسا دینے والی گرمیوں کے لمبے دن ہونے کی وجہ سے ابھی مکمل اُجالا تھا۔ ظاہر ہے ان دنوں شام دیر سے ہوا کرتی ہے۔ کُچھ بھی ہو کوئے کے لوٹنے کی تاخیر سے شام کے سائے بڑھ جاتے تو میرے لئے بھی مایوس ہو کر کھڑکی سے ہٹنے کے سِوا کوئی چارہ نہ رہتا۔ اب تو یہ خدشہ بھی لاحق رہنے لگا تھا کہ شائد ننھی سی جان اِس روٹی کو یکسر بھول چکی ہوگی۔

اتفاقاً نگاہیں ایسے دو کوؤں پر پڑیں جو اُڑتے ہوئے آکر مقابل کے دیوار کی مُنڈیر پر جا بیٹھے۔ گمان تھا کہ کارنامہ انجام دینے والا کوا ان میں سے نہ ہوگا۔ دونوں کچھ دیر

چھت پر مچلتے پھُد کتے رہے پھر ایک ہی جست میں نالی کے کنارے ٹھیک چیتھڑے کے قریب جارُکے۔ اِن میں سے ایک پہل کرتا ہوا آگے بڑھا اور چونچ کی مدد سے چیتھڑے کو کھینچ کھانچ کر پوری طرح ایک طرف سرکا دیا۔ اب ایک بھیگی اور پھولی ہوئی نرم سی روٹی اُن کے سامنے تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر احترام جتاتے ہوئے پر تکلف انداز میں اس پر ٹوٹ پڑے اور خوب دعوت اُڑانے لگے۔

کوّا کھانے پینے کے معاملے میں غیروں کی شرکت کبھی گوارہ نہیں کرتا۔ شائید دوسرا کوّا اُس کا اپنا جوڑی دار تھا۔ جسے وہ خود بُلا لایا ہوگا۔

یہ سب دیکھ کر مجھے سارے کوّوں کی ذہانت پر اعتبار آ گیا۔ واقعی دانائی کے لحاظ سے اُس کی حکمت عملی قابل داد اور بے مثال تھی۔

............☆☆☆............

عِشق ناتراشیدہ

اِدھر بادلوں کی اوٹ میں سے جھانکتا سورج اپنے سفر کے تیسرے پڑاؤ پر تھا کہ یکا یک درجہ حرارت میں کمی آگئی۔ ٹھنڈی ہواؤں کے تھپیڑوں سے پیڑ پودے تھرّانے لگے۔

''اُدھر یک منزلہ گھروندے کے اندر نیم تاریک کوٹھری کی چھوٹی سی کھڑکی ہوا کے جھونکوں سے کھڑکھڑائی تو نیم جان شوہر کے سرہانے بیٹھی نسی بی تشویش کے مارے بڑ بڑا اُٹھی۔''

''شاید طوفان آنے کو ہے۔''

پھر جو پیڑ پودوں کی شاخوں کے تیزی سے سرسرانے کا شور بلند ہوا تو اُس کے تپتے ماتھے سے جھٹ پٹ ہاتھ ہٹا کر بولی۔

''سُنا تم نے قاسم جان، تمہارے بھیا جانے اس بار کیوں نہ آئے۔ آئے ہوتے تو علاج کا کچھ نہ کچھ بندوبست ہو گیا ہوتا۔ جانے کہاں مصروف رہ گئے ہیں......''

بسترِ مرگ سے چپکے قاسم خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ مسلسل بیماری اور کمزوری کے چلتے صرف نحیف سی کراہنے کی صورت رہ گئی تھی۔ نسی بی تڑپ کر بولی۔

''کیا کروں...... اِس ویرانے میں کوئی بندۂ خدا بھی تو نہ ملا جو اُس تک دوبارہ پیغام بھجوا پاتی...... خیر تم وسوسہ نہ لینا۔ خراب موسم کے چلتے چرواہے وقت سے پہلے پہاڑی سے لوٹنے والے ہونگے...... مجھے ابھی سے اپنے ڈھور ڈنگروں کو بند کرنا ہوگا۔ اسکے بعد چھت پر جا کر چرواہے کی راہ دیکھوں گی اور اُس سے مل کر تمہارے بھیا تک پیغام بھجوادوں

گی۔تم پریشان نہ ہونا۔میں بس گئی اور آئی۔''

جواب میں قاسم خان صرف کراہتا رہ گیا۔نسی بی نے اُس کے سینے پر سیاہ رنگ کی چھلی (بکرے کے بالوں کی بُنی ہوئی گرم کھُر دری کمبل) دُرست کرلی اور پھُرتی سے اُٹھ کر باہر نکلی، اور دوڑ بھاگ کر سب سے پہلے آنگن کے مرغے مرغیاں سمیٹ لیں۔ انہیں پکڑ کر ڈربے میں بند کیا...... کھیتوں میں دائیں بائیں چرتے ڈھورڈنگروں کی اور بھاگی۔انہیں ہنکار پچکار کر یکجا کر کے تیزی سے باڑھ کے اندر لے آئی اور جھٹ پٹ گاؤ خانے کے اندر دھکیلتی ہوئی معذرت طلب انداز میں کہنے لگی۔

''معاف کرنا میری چہیتیو......موسم بگڑ رہا ہے۔آج وقت سے پہلے قید ہونا پڑے گا۔چلو چلو۔جلدی کرو۔وقت بہت کم ہے۔ہُش ہُش......ہا......ہا......''۔

گائے بے چاری شریف النفس تھی، چُپکے سے اندر چلی گئی۔بھیڑ بکریوں نے بھی اعتراض نہ کیا مگر یاک اور زومو (گھُچے دار دُم والی لداخی بیل گائے) کو وقت سے پہلے قید ہونا کہاں راس آتا۔زوموڈھیٹ نٹ کھٹ کی طرح گاؤ خانے کے منہ پر ڈٹ گئی۔نسی بی نے پشت پر ہاتھ پھیر کر عاجزی سے کہا۔

''ضِد نہ کر میری لاڈو......جانتی ہوں ابھی شام ہونے میں دیر ہے، پر یہ بھی جان لے، اِدھر موسم کا تیور بگڑا ہے اُدھر تیرے مالک کی حالت اچھی نہیں......خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔چل چل اندر چل۔ مجھے اُس کی بھی تو دیکھ بھال کرنی ہے۔اُسے کچھ ہو گیا تو ہم سب کہیں کے نہ رہیں گے۔چل نا اماں......آج تو مان میری بات۔''

اُس کا اندازِ تخاطب ایسا تھا کہ جیسے زوموسچ مُچ زُبان فہم ہو۔ساری باتیں سمجھتی ہو۔ زومو کے عقب میں کھڑا یاک بھلے ہی مالکن کی بات نہ سمجھ پایا، مگر زومو کے ایسی سینگ ماری کہ غریب پُٹھ میں چھبن محسوس کر کے اُچھل کر کمان سے نکلے ہوئے تیر کی سی تیزی کے ساتھ اندر کو سرک گئی اور مُڑ مُڑ کر غصیلی نگاہوں سے یاک کی اور دیکھتی رہ گئی۔نسی بی نے بھوسا

چارا لاکر نا نند میں پھیلا دیا۔ گائے اپنی لمبی زبان نکال کر اس کا ہاتھ ایسے چاٹنے لگی، مانو پریشانی سمجھ کر دلاسہ دے رہی ہو۔ ویسے یہ بے زبان مزاج کے عین مطابق دیالو تو تھی ہی، سمجھدار بھی تھی۔ بچپن سے ہی اُس کے ہاتھوں کی پلی بڑھی تھی، اس لئے دونوں میں والہانہ لگاؤ تھا۔ نسی بی نے پیار سے ماتھا سہلایا......اور......ٹہنیوں سے بُنے ڈھال سے گاؤ خانے کے مُنہ کو ڈھک کر بیرونی پھاٹک بند کرنے چلی گئی۔

لوٹی، تو راہداری میں دیوار سے لگی چوبی سیڑھی کے پائے چڑھ کر چھت پر جا پہنچی......یقین تھا، موسم کے بدلتے تیور سے گھبرا کر مقامی گاؤں کے چرواہے بالائی درّے سے ضرور لوٹ رہے ہونگے۔ بس یہی ایک ذریعہ تھا شوہر کی بیماری کا پیغام دیور غلام خان تک دوبارہ پہنچانے کا۔

مگر وہاں......دُور دُور تک کوئی آدم تھا نہ آدم زاد......

آج اُسے پہلی بار گھروندے کے اطراف میں ویرانے کا احساس ہوا......

اطراف میں کوئی بستی تو کیا جھونپڑی تک نہ تھی۔ مُنہ زور دریا کے پار بہت دُور اُس کا بڑا سا اپنا گاؤں تھا جسے محبت کے چکر میں لگ بھگ دو دہائی پہلے والدین اور گاؤں والوں سے بغاوت کر کے اپنے عاشق صادق کے سنگ چھوڑ آئی تھی۔ کیا کرتی......نمبردار کا بیٹا قاسم خان اُس کے حسن و جمال پر جی جان سے فدا جو تھا......باپ نے لڑکی کے غریب پریوار پر کافی دباؤ ڈالا۔ مگر قاسم خان نے سرکش ہو کر دوسرے گاؤں کے عالم سے نکاح پڑھوا ہی لیا۔ اور دونوں گاؤں چھوڑ کر اس بیابان میں چلے آئے......خود تو کیا آتے، اُلٹا نمبردار کی پیروی میں جرگے نے نافرمانی سے ناراض ہو کر بطور سزا حقہ پانی بند کر کے دیس نکالا دیا تھا......تبھی تو اس پار کے ویرانے میں برلب دریا الگ تھلگ اپنی دنیا بسانی پڑی تھی۔

بنجر زمین آباد کر کے......

پھل دار پیڑ پودے اُگا کر جینے کا سامان پیدا کیا تھا......

چرند پرند پال کر رونق بڑھائی تھی۔

دُور دُور تک برستے سناٹے سے مایوس ہو کر نسی بی نے اوپر کی جانب دیکھا......

کالی گھٹاؤں کی اٹکھیلیوں میں اُلجھ کر وجود کھوتا آسمان......

بادلوں میں اٹ کر اوجھل ہوتی پہاڑی چوٹیاں......

تیز و تند سرد ہواؤں کے سرسراتے جھکّڑ......

سبھی موسم کی پہلی برفباری کا امکان جتا رہے تھے......ٹھنڈ کے احساس سے اُس نے جھرجھری لی۔ سر سے اُڑتے سیاہ اوڑھنی کے پلّو کو منہ پر اچھی طرح لپیٹ لیا۔ پھڑ پھڑاتے چوغے کے دامن کو تہہ بند سے کسنے کے بعد ایک بار پھر بالائی ڈھلوان کی پگڈنڈی پر نگاہ ڈالی جہاں اب بھی ہو کا عالم تھا......

وہ تڑپ کر سوچنے لگی کہ اب ایسا اور کیا کرے کہ شوہر کی جان میں جان آئے...... شفایابی کے سارے گُر تو آزما لئے......اچھا کھلایا......کڑوا پلایا......کالی مرچ کی چائے، کاڑھا جوشاندہ......تھوکپا (گوندھے ہوئے آٹے کے لچھوں کا نمکین شوربہ)......سب کچھ، مگر نہ ہوش آیا، نہ فائدہ ہوا۔ حالت سُدھرنے کے بجائے مزید بگڑ گئی۔ اب اور کیا تدبیر کرے کہ جان کی خیر ہو۔

وہ پریشانی کی حالت میں سوچ سوچ کر مُرجھائی جا رہی تھی......

اِس دس سالہ مُدّت میں کوئی اولاد بھی تو نہ ہوئی تھی جو اِس وقت راحت جان بنتی۔ دُکھ کے مارے آنسوؤں کے چند قطرے ڈھلک کر خسار پر آ گئے......اب تو یہ اندیشہ بھی ستانے لگا کہ کہیں شوہر کی سانس اٹک گئی تو اِس ویرانے میں اکیلی کیا کرے گی۔ کیسے ایک لاش کے سنگ تنہارات کی ہولنا کی سہہ پائے گی۔

تبھی گھبراہٹ کے مارے بے تحاشہ خدا کو یاد کیا۔

''یا اللہ، میری مدد فرما......کوئی تو مسیحاء نفس بھیج دے جو اس مشکل وقت میں

کام آئے۔''

''پھر جیسے خدا نے اُس کی سُن لی......

گھروندے کے قریب منہ زور دریا کنارے سے ایک پتلی سی رہگذر دوسرے مقاموں کو جاتی تھی جس پر کبھی کبھار ہی کوئی بھولا بھٹکا مسافر محوِ سفر نظر آتا تھا۔ یکا یک گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سے ماحول لرز اُٹھا۔ مخالف سمت سے ایک گھڑسوار برق رفتاری سے آتا دکھائی دیا۔ وہ چوکنا ہوگئی۔ اُدھر سے آنے کا مطلب ہی تھا کہ اُسے دریا پار کے گاؤں سے ہوکر گُزرنا ہے۔

وہ حواس باختہ سی ہوکر دیوانہ وار چھت سے اُتری اور راستہ روکنے کے لئے تیزی سے رہگذر پر جا کھڑی ہوگئی۔ گھڑسوار نے قریب پہنچ کر لگام کھینچا......نسی بی کی جانب معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ اور ذرا سا توقف کے بعد پوچھا۔

''خیریت تو ہے ہمشیرہ......کچھ پریشان لگتی ہو۔!''

''میرا شوہر کئی دنوں سے کھاٹ سے لگا پڑا ہے، شیرہ، قہوہ سب پلایا۔ کوئی اثر نہ ہوا......آپ جاتے جاتے اُن کی بیماری کا پیغام دریا پار کے دیہات میں میرے دیور غلام خان تک پہنچا دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ اِس اکلوتے گھروندے کا حوالہ دیتے ہی اُس کا گھر آسانی سے مل جائے گا۔''

''ہاں ہاں......کیوں نہیں۔ مجھے وہیں سے تو ہوکر جانا ہے......کیا میں نظر بھر آپ کے شوہر کو دیکھ سکتا ہوں......؟''

پل بھر کے لئے وہ سوچ میں پڑ گئی۔

زمانہ قدیم میں پچھڑی دیہاتوں کے مکانوں کے در و در بچے غیر مرئی مخلوقات کی مداخلت کے ڈر سے پست قد اور چھوٹے بنائے جاتے تھے، تاکہ شام کے بعد کسی بھی شخص

کے تعاقب میں آنے والی بلا کا گھر میں داخلہ ممکن نہ ہو سکے...... اِس گھروندے کے بھی سارے دروازے پست قد تھے......

نسی بی نے تیزی سے اُجالے کا اندازہ لیا۔

ابھی دن کا تیسرا ہی پہر تھا۔ ایسے میں اجنبی گھڑسوار کے سنگ کسی آسیب کے چپکے ہونے کا امکان ہی نہ تھا۔ تبھی اُس کے لب ہلے۔

''جی......جی ہاں...... بڑی مہربانی ہوگی...... آیئے نا۔''

اجنبی گھوڑے سے اُتر کر اُس کی رہنمائی میں چلدیا۔

☆

درے کی ٹھنڈی ہواؤں سے کوٹھری کی خنکی بڑھ چُکی تھی۔ نسی بی نے داخل ہوتے ہی دریچے بند کر دیئے۔ ایسا کرتے ہی کمرے کی روشنی مدھم پڑ گئی۔ اجنبی شخص دروازے کی چوکھٹ سے سر جھکا کر گھُستے ہوئے سلام بجالایا۔ کوئی جواب نہ پا کر سلام کو دہرایا بھی۔ مگر جواب پھر بھی نہ دارد۔

نسی بی آواز دے کر بولی۔

''سلام کا جواب دو قاسم خان۔ دیکھو ایک مہمان آیا ہے۔''

مگر وہاں کوئی سرسراہٹ نہ ہوئی...... نسی بی نے پریشان ہو کر اجنبی کی جانب دیکھ کر کہا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے ہی کراہ رہا تھا۔''

''میں دیکھتا ہوں۔''

کہہ کر وہ جوتے سمیت آگے بڑھا۔ دھیرے سے اُسے جھنجھوڑا۔ ہتھیلی کو نتھنوں کے قریب لے جا کر سانسوں کے اخراج کا جائزہ لیا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکنیں محسوس کیں مگر وہاں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ تھی...... ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ چکے تھے، وہ زندگی

کی جنگ ہار کر نعش میں بدل چکا تھا۔ نسی بی کے لئے غیر یقینی کی صورت پیدا ہوگئی۔ اجنبی کو قاسم خان کے ہاتھ پیر درست کرتے دیکھ کر وہ سینے پر ہاتھ مار کر بے تحاشہ بلبلا اُٹھی۔ آہ وبکا کرنے لگی۔

''ہائے میرے قاسم خان۔ مجھے تنہا چھوڑ کر جانے کا وعدہ تو نہ تھا۔ ہائے اب میں کِس کے سہارے جیوں۔ کیا کروں...... کہاں جاؤں۔''

اُسے زار زار روتے دیکھ کر اجنبی نے دلاسہ دیا۔

''رونے کا کوئی فائدہ نہیں ہمشیرہ۔ بس کرو۔ صبر سے کام لو۔ صبر کرنے کے سِوا کوئی چارہ نہیں۔ اور ہاں، یہاں کوئی اپنا ہو تو پاس بلا لو جب تک کہ گاؤں سے لوگ آجائیں۔''

''نہیں بھائی صاحب۔ اس ویرانے میں ہم دونوں کے سِوا تیسرا کوئی نہیں ہے۔''

''تو ٹھیک ہے میں جلدی سے جا کر لواحقین کو خبر کرتا ہوں۔ آپ حوصلہ رکھیں۔ خدا نے چاہا تو وہ اندھیرا ہونے سے پہلے پہنچ جائیں گے۔''

بات ختم کر کے وہ تیزی سے باہر نکلا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر ایڑ لگائی اور ہوا کے دوش پر برق رفتاری سے آگے بڑھتا چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی نسی بی تنہا پڑ گئی۔

وقت دبے پاؤں بڑھنے لگا۔

نسی بی قاسم خان کے نعش کو دیکھ دیکھ کر روئی...... ذہن میں کھٹے میٹھے خیالوں کا طوفان برپا ہوا...... خوشگوار گھڑیوں کی یادیں ستانے لگیں...... خیالی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوئے حسرت بھری نگاہیں رہ رہ کر دریچے کی جانب بھی اٹھتی رہیں......

دن کی نیم روشنی دھیرے دھیرے ماند پڑتی جارہی تھی...... برف کے ننھے گالے

بھی گرنے لگے تھے۔ اب تو صرف دیور غلام خان ہی واحد سہارا تھا، مگر بڑھتی برفباری اور گھٹتی روشنی میں اُن کی آمد کے امکانات معدوم ہونے لگے تھے۔ اُس نے اُٹھ کر طاق پر رکھا چراغ روشن کیا۔ سامنے پڑے جھاڑ اور سوکھے اوپلے تین پتھری چولھے میں ڈالے۔ انہیں صبح کی راکھ کے نیچے دبی بچی کھچی چنگاریوں سے سُلگایا...... بھوک تو قاسم خان کی وفات سے ہی مٹ چُکی تھی۔ کچھ بھی پکانے کا من نہ ہوا۔ البتہ دھیان برابر دروازے کی آہٹ پر لگا رہا کہ کوئی پل میں گاؤں والے پہنچتے ہوں گے۔

مگر جوں جوں وقت شیطان کی آنت کی طرح بڑھتا گیا، نا اُمیدی کفر بنتی گئی۔

رات کا پہلا پہر شروع ہوا تو وسوسے سر اُٹھانے لگے۔ آنکھوں کی نیندیں بھی تنہائی اور بے جان نعش کے ہوتے جل چُکی تھی۔

مردے کے ساتھ وقت گذارنا کسی ڈراؤنے خواب سے کم نہیں ہوتا۔ گذرتے وقت کے ساتھ دل میں طرح طرح کے اندیشے جنم لینے لگے۔ جب بھی وہ پُرتشویش نگاہوں سے لاش کی جانب دیکھتی تو محسوس ہوتا جیسے وہ آنکھیں کھولے اُسے گھور رہا ہے، وہ سہم جاتی، جھٹ سے نگاہیں پھیر کر چولھے کی آنچ بڑھانے لگتی اور خود کو دلاسہ دے دیتی کہ یہ صرف من کا وہم ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں...... جب بھی آگ کے شعلے ماند پڑتے تو اُسے لگتا جیسے میّت سر اُٹھانے لگی ہے، وہ گھبرا کر چولھے میں جھاڑ ٹھونستی اور تیز آنچ کی لپکوں میں میت کی جانب چور نگاہوں سے دیکھنے لگتی پھر پہلے کی طرح بے سُدھ پا کر اطمینان کی سانس لے کر رہ جاتی۔ یوں چولھے کی آگ سُلگاتے سُلگاتے ایک بار وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں کھوگئی......

آہ...... کتنے خوشگوار دِن تھے۔ سماج سے کٹ چُکنے کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو خوب سنبھالا تھا، خوب دلاسہ دیا تھا۔ مل کر خوبصورت خواب سجائے تھے۔ اکٹھے جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ یکا یک ان قسموں کو یاد کر کے وہ لرز اُٹھی، احتمال ہوا کہ

قاسم جان کی میت وعدہ پورا کرنے کے لئے کہیں سچ مُچ اٹھ کر دبوچ ہی نہ لے۔ زندگی کِسے پیاری نہیں ہوتی ...... کہیں مرنے والے کے ساتھ بھی مرا جاتا ہے۔

وہ ان ہی خیالی غوطوں میں تھی کہ چولھے کی مدھم پڑتی آنچ میں اُس نے قاسم خان کی میت کو ایک بار پھر اُٹھتے دیکھا۔ اب تو اُس کی جیسے جان ہی نِکل گئی۔ ہڑبڑا کر اِدھر اُدھر ہاتھ مارا اور جھٹ سے آنچ پر بھوسا ڈال دیا۔ آگ بھڑکی تو کچھ ٹہنیاں اور لکڑیاں بھی جھونک دیں۔ یہ تو اچھا ہوا کہ غفلت نہ برتی اور شعلوں کے بلند ہوتے ہی میت پہلے کی طرح ساکت ہوگئی۔ ورنہ آنہونی ہوگئی ہوتی۔

یوں میت کی بے جا تحریک کے خوف سے وہ لکڑیاں ڈالتی رہی۔ آگ سُلگاتی رہی۔ یہاں تک کہ بیتے وقت کے ساتھ جھاڑ پھوس کی مقدار میں قِلت کا سامنا ہونے لگا۔ اب تو اس نے زیرِ چھت کی ٹہنیاں نوچ نوچ کر چولھے کے سامنے ڈھیر کر دیے۔

میت کی غیر یقینی صورت حال کی وجہ سے آگ کی لپٹیں بلند کرنے کا سلسلہ رات کے تیسرے پہر تک جاری رہا۔ اب جو چوتھے پہر ایندھن کی گنجائش نہ رہی تو آخری لکڑی کے ٹکڑے کو الاؤ پر جما کر بلند ہوتے شعلوں کی روشنی میں وہاں سے نکل بھاگی اور تیزی سے گاؤ خانے میں گُھس کر ٹہنیوں سے بُنے دروازہ نما ڈھال سے جھٹ پٹ گاؤ خانے کے پست قد چوکھٹ کو ڈھک کر گائے کے عقب میں فریاد کرتی ہوئی جا چھپی کہ۔

''امّاں آج تو تُو ہی بچالے۔ اپنی مالکن کو بچالے۔ وہ مجھے دبوچنے آرہا ہے۔ بچالے امّاں۔ مجھے بچالے، ورنہ تیری مالکن کی خیر نہیں۔''

مالکن کی گھبراہٹ سے گائے چوکنا ہوگئی اور تھوتھنی گھما کر دروازے کی اور دیکھنے لگی۔

اُسی پل سراسراتے ہواؤں کا ایک تیز جھونکا در و دیوار کو چھو گیا۔ دروازے کے روزن پر سرخ انگارے جیسی دو آنکھیں نمودار ہوگئیں۔ بیٹھے ہوئے چوپائے بوکھلا کر اُٹھ

کھڑے ہوئے۔ ایک بھگدڑ سی مچی۔ گائے چوکنا تو تھی ہی...... غیض و غضب کے عالم میں مُڑی اور پھنکارتی ہوئی دروازے پر ڈٹ گئی، سینگیں گُھما گُھما کر میت کو للکارنے لگی۔ اِس مقابلے میں یاک اور زومو نے بھی مورچہ سنبھالا۔ اُن کا جارحانہ رویہ بھی قابل دید تھا۔ کافی دیر گھمسان کا رن رہا۔ بلآخر چوپایوں کی جیت ہوگئی۔ انگارے جیسی آنکھیں دروازے کے روزن سے ہٹ گئیں مگر پھر بار بار گاؤ خانے کے چھوٹے سے بیرونی دریچے میں نظر آتی رہیں۔ یہاں تک کہ صبح کی پہلی کرن میں دیور غلام خان کی مانوس آواز نے چونکا دیا۔

''پھاٹک کھولئے بھابی جی...... گاؤں سے لوگ آئے ہیں۔''

وہ بدحواسی کے عالم میں کچھ دیر دھیان لگا کر سنتی رہی۔ اُسے اپنے کانوں پر یقین نہ آرہا تھا، پھر جب عورتوں کی نمایاں بھنبھناہٹ کا احساس ہوا تو فوراً گاؤ خانے سے آنگن کی اور دوڑ لگادی۔

برف کی دبیز چادر سے گرد و پیش ڈھک چُکا تھا۔ وہ پھاٹک کھولتے ہی غش کھا کر عورتوں کی باہوں میں جھول گئی۔

گاؤں سے آئے لوگ آنگن میں داخل ہوتے ہی گھروندے کے گرد برف کی سفید چادر پر ننگے پیروں کے ان گنت نشانات دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے...... غلام خان حواس باختہ ہوکر کوٹھری نما کمرے کی اور بھاگا۔ اندر پہنچ کر صبح اول کی نیم مدھم روشنی میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے بھائی کی لاش پر توجہ مرکوز کی جو بالکل بے حس و بے حرکت پڑی ہوئی تھی۔ اُس کی پتھرائی ہوئی ادھ کھُلی آنکھوں میں عشق و محبت کا جنون اب قصہ پارینہ بن کر گم ہو چکا تھا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

کہتے ہیں قاسم خان کی بے چین روح اپنی محبوبہ نسی بی کو دبوچنے کے لئے رات کے آخری پہر تک گھروندے کے گرد بھٹکتی رہی تھی۔ ''واللہُ عالم الغیب''۔

..........☆☆☆..........
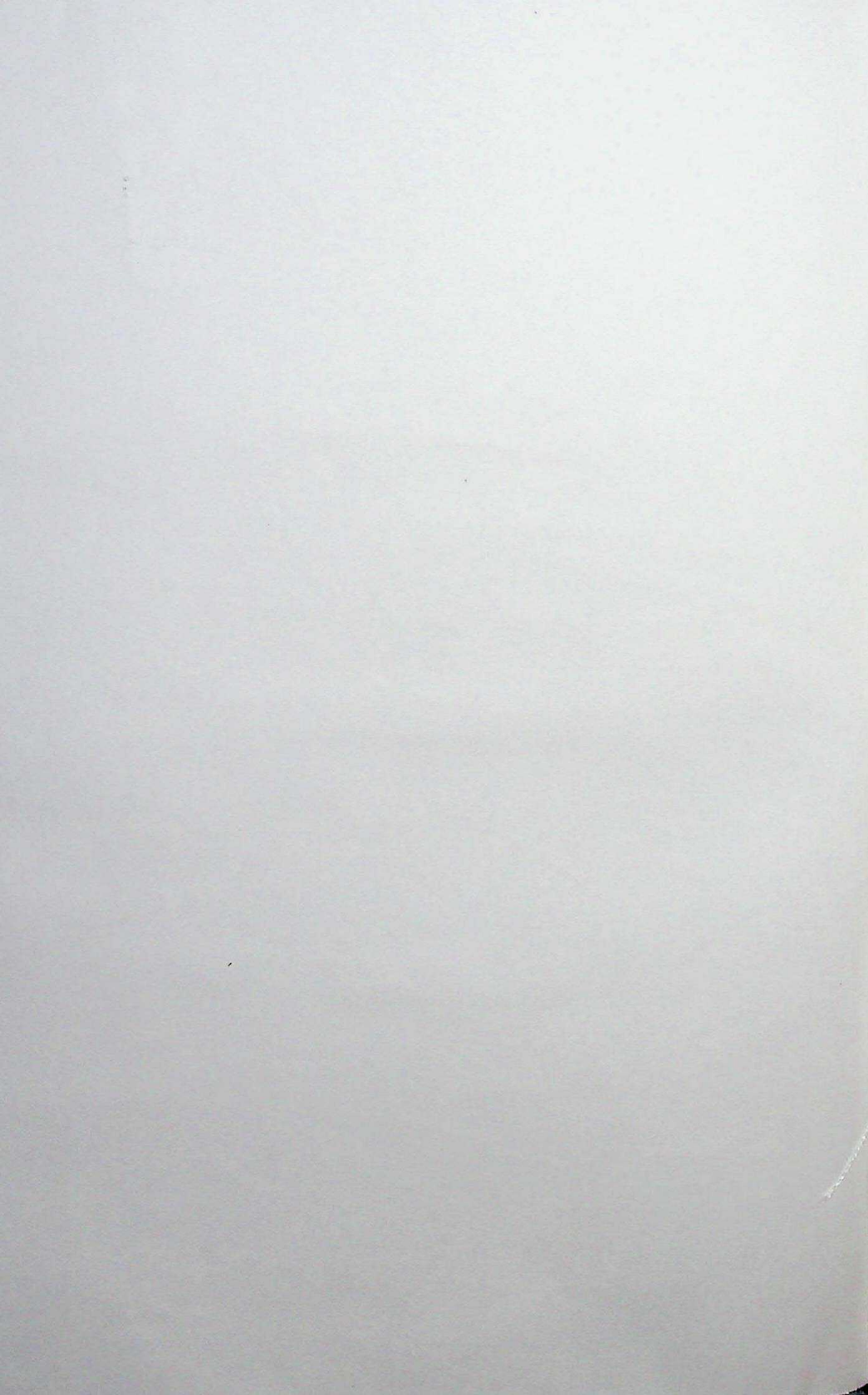
"TOOT, TEE-JUDTEE-ZINDAGEE"

AFSANAY/KAHANIYAN

By: Abdul Rashid Rahgeer Ladakhi

گذشتہ چند برسوں کے دوران مجھے عبدالرشید راہگیر کے کچھ افسانے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں وہ افسانے بھی شامل ہیں جو نگینہ انٹرنیشنل میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ افسانے پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ راہگیر صاحب زمانے کی حقیقتوں کو افسانوی صورت میں پیش کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں اکثر زندگی کی بہت ساری خوبصورتیاں اور بدصورتیاں تصویروں کی صورت اپنا لیتی ہیں۔ ان تصویروں میں کرب ہے اور درد بھی۔ لداخی کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے افسانوں میں لداخی زندگی، لداخی رہن سہن، لداخی تہذیب وتمدن کی جھلکیاں بخوبی دیکھی جاسکتی ہیں جو ان افسانوں کو اور بھی دلچسپ بناتی ہیں۔ راہگیر صاحب اپنے افسانوں میں زبان وبیان کی جانب بھرپور توجہ دیتے ہیں اور اپنے افسانوں کو اپنے مخصوص ماحول کا حصہ بنا کر ضبط تحریر میں لاتے ہیں اور کبھی کبھار راہگیر صاحب اپنے افسانوں میں ایک اُستاد کی صورت میں بھی سامنے آتے ہیں اور اپنے کرداروں کو راہ راست پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔

وحشی سعید

عبدالرشید راہگیر کے دیگر تخلیقات
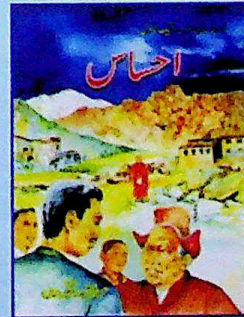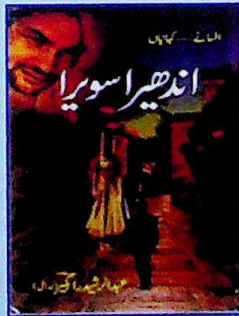
MEEZAN PUBLISHERS

OPPOSITE FIRE SERVICES HEAD QUATERS,
BATAMALOO, SRINAGAR-190009, KASHMIR.
CELL: 9419002212, 8494002212, 7006773403
email: meezanbooks2020@gmail.com, meezanpublishers@gmail.com

₹ 350/-
978-81-19234-99-8
9788119234998